مجلّہ طلوعِ اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ______ لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660

ٹیلی فون : 876219

فیکس : 92-42-876219

انتظامیہ ادارہ طلوعِ اسلام

چیئرمین:- ایاز حسین انصاری

ناظم:- محمد لطیف چوہدری

مدیر مسئول:- محمد لطیف چوہدری

مجلس ادارت:- میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز

ناشر:- عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع:- خالد منصور نسیم

مطبع:- النور پرنٹرز و پبلشرز

3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔ 54500

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ	2
تاریخی شہادت	علامہ غلام احمد پرویزؒ	5
مملکتوں کی بقاو فروغ کا ابدی اصول	محمد عمر دراز	51
ایک غلط فہمی کا ازالہ	ڈاکٹر سید عبدالودود	59
خاک ہو جائیں گے ___	عظمت ناز	65
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	محمود الحسن	68
تکلف برطرف	منظور احمد (ناروے)	72
نقد و نظر	ادارہ	76

جلد 48 شمارہ 6 جون 1995ء

بدل اشتراک

فی پرچہ =/10 روپے

اندرون ملک سالانہ 120 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ 550 روپے

آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا 750 روپے

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کشمیر کے مجاہدو - ہم تمہارے ساتھ ہیں

یوں تو خون کے چھینٹے اور آتشِ فتنہ کی چنگاریاں' فرشتوں کی نگاہوں نے خمیر آدم میں ہی بھانپ لی تھیں لیکن سرزمینِ کشمیر میں خون ریزی اور فساد انگیزی کا جو منظر آج شعلہ بار ہے' چشمِ فلک نے اس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو گی- ایسے لگتا ہے جیسے دیوتاؤں کے پجاریوں نے اپنے عفریتی لشکروں کے ہجوم پہاڑوں کے غاروں سے آزاد کر کے بے لگام چھوڑ دیئے ہیں کہ وہ کشمیریوں کی بستیوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹ پڑیں اور بوڑھے' بچے عورت' بیمار' کمزور' ضعیف کسی کی تمیز روا نہ رکھتے ہوئے جو سامنے آئے اسے آگ میں بھونتے چلے جائیں- ان بے کسوں کا قصور ہے تو فقط اس قدر کہ زُنّار پوشوں سے آزادی کے طلبگار ہیں- عین اس طرح جس طرح کل تک یہی زُنّار پوش انگریزوں سے آزادی کے طلبگار تھے- انگریز اس معاملے میں لاکھ سخت گیر ہونگے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے نہ کوئی مندر جلایا نہ کوئی مورتی توڑی مگر دنیا بھر کو مذہبی روا داری اور سیکولرزم کا یقین دلانے اور اہنسا کی مالا جپنے والے ان ہندوؤں کے ہاتھوں ان علاقوں میں جو ان کے تسلط میں ہیں' نہ کوئی مسجد محفوظ ہے نہ درگاہ سلامت۔

پہلے انہوں نے سومنات کی جامع مسجد کو مندر میں تبدیل کر کے' اس میں پتھر کی مورتیاں سجا دیں اور اس طرح وہ مسجد جس میں ایک عرصہ تک توحید کے نغمے گونجتے رہے آج اس مسجد میں ناقوس بجتا ہے اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے- مسلمان ابھی اس سانحہ کو بھول نہ پائے تھے کہ بابری مسجد مسمار کر دی گئی- یہ زخم ابھی تازہ تھا کہ ہنومان کے سپوتوں نے چرار شریف میں نہ صرف حضرت نورالدین ولی کی درگاہ کو زمیں بوس کر دیا بلکہ درگاہ سے ملحق مسجد اور اس میں محفوظ نوادرات کو بھی جلا کر راکھ کر دیا- یہ چند مثالیں ہیں امن کے پجاریوں کے استبداد و قہرمانیت کی' ان سینکڑوں مثالوں میں سے جو ہندوستان کی مزعومہ جمہوری حکومت' ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر بلا دریغ و بے محابا روا رکھے ہوئے ہے- ان چند مساجد و معابد کا کیا ذکر' ان کے ہاں وہ کونسی شے ہے جو مسلمانوں کے نزدیک محبوب و محترم ہے اور اسے وہاں محفوظ سمجھا جا سکتا ہے- جان' مال' عزت' آبرو' عصمت' ناموس سب ان کے رحم و کرم پہ ہیں اور یہ وہ ہیں کہ جنہیں خبر ہی

نہیں کہ ؎

روشِ بندہ پروری کیا ہے

ہندوؤں نے غالباً یہ سمجھ لیا ہے کہ پاکستان کا مسلمان اتنا طاقتور نہیں رہا کہ اس سے خوف زدہ ہوا جائے۔ مغربی پنجاب میں ہندوؤں کے ہاں ایک مثل مشہور تھی کہ "مسلے نوں ٹرخائے۔ ٹرخ جائے تے ٹرخ جائے نئیں تے آپ ٹرخ جائے"۔

آج ہندوستان کا ہندو اپنی قوت کے نشہ میں مسلمانوں کو عجیب قسم کی بھبکیاں دے رہا ہے۔ اگر مسلمان نے اپنے دل میں سمجھ لیا ہے کہ وہ واقعی کمزور ہو چکا ہے تو ہندوؤں کی بھبکیاں فی الواقعہ کارگر ہو جائیں گی اور اگر اس کا ایمان اس پر ہے کہ

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم!

تو یقین مانئے ہندو اس ضیغم نیستاں کی ایک دھاڑ کو بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مصافِ زندگی میں سپاہ اور اسلحہ بڑی چیز ہے لیکن یاد رکھئے! قوموں کی قوت کا راز ان کی سپاہ اور اسلحہ کی فراوانی میں نہیں ہوتا۔ یہ راز ان کے عزم و ثبات اور ایمان و یقین میں پنہاں ہوتا ہے۔ یقین کی قوت دنیا کی ہر قوت پر غالب ہوتی ہے۔ اگر اس پر شہادت کی ضرورت ہے تو پوچھئے بدر و حنین کے ذرّات سے جنہوں نے مومنین کو بے تیغ لڑتے اور فاتح و منصور لوٹتے دیکھا ہے۔

مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کر سکتا۔ وہ خواہ مخواہ جنگ کی آگ کو مشتعل نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں امن و سلامتی چاہتا ہے۔ لیکن وہ کسی اور کو بھی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ امن کو خراب کرے اور خدا کی مخلوق کو ستائے۔ ہندوؤں نے پچھلے 48 سال میں دنیا پر روشن کر دیا ہے کہ وہ کس قدر امن و سلامتی کا دشمن اور ظلم و فساد کا رسیا ہے۔ اس کی علّت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہے۔ لہٰذا ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعمِ باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس کا عزم کرے کہ جو آنکھ اس کی طرف بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائیگی، خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہئے جو ابدالی کی تلواروں نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھئے! اگر ہندو کو ایک شکست مل گئی تو پھر یہ خود بھی امن سے رہیگا اور برصغیر کا امن بھی بحال ہو جائیگا۔

یہ درست ہے کہ ہمارے اکابرین ہماری ان توقعات پر پورے نہیں اُتر رہے جو ہم نے ان سے وابستہ

کی تھیں- یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہماری حکومت کی مشینری میں بہت سے نقائص ہیں- لیکن یہ چیزیں قطعاً" اس کا جواز نہیں بن سکتیں کہ ہم پاکستان کے استحکام کی طرف سے بے فکر ہو جائیں- پاکستان تمام ملت اسلامیہ کی مشترکہ امانت ہے- لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ اپنے کارکنانِ حکومت کی خامکاریوں سے قطع نظر ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے استحکام کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہے کہ پاکستان کی بقا خود ہماری بقا ہے- سلام ہے ملّت کے ان گمنام مجاہدوں کو جو مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں- یہ جنگ ہماری جنگ ہے-

ملّتِ اسلامیہ کے گمنام شہیدو! یہ سچ ہے کہ وقتِ شہادت تمہارے حلق میں پانی کی ایک بوند ٹپکانے والا بھی کوئی نہ تھا لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ آج تمہاری یاد میں کروڑوں آنکھیں نمناک ہیں- تمہاری قربانیوں نے ہماری اُمیدوں کی دنیا میں پھر سے ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی ہے- تمہاری قابلِ رشک شہادت پر لاکھوں زندگیاں نچھاور ہوں کہ اسی میں قوم کی حیات کا راز مضمر ہے-

کشمیر کے مجاہدو! ہم تمہارے ساتھ ہیں

قرآنی فکر پر مبنی نئی کتب

برہان القرآن	از خواجہ احمد الدین	150/=
اسلامی تہوار و رسومات	از پروفیسر رفیع اللہ شہاب	150/=
The Political History of Pakistan	by Prof: Rafi Ullah Shehab	150/=

ملنے کا پتہ

دوست ایسوسی ایٹس

الکریم مارکیٹ اردو بازار' لاہور

فون : 712 29 81

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

علّامہ غلام احمد پرویزؒ

تاریخی شہادت

(علیٰحدگی کی اسکیم قرآنی روشنی میں)

آج جگہ جگہ سے یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہ تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔ ہو سکتا ہے ایسے بلند بانگ دعاوی کرنے والوں نے یقین کر لیا ہو کہ اب تک تمام تاریخی شواہد نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہونگے یا ہو سکتا ہے' اس کا اہتمام بھی کر لیا گیا ہو' لیکن انہیں شاید یہ علم نہیں کہ اس زمانہ کے طلوع اسلام کے فائل اس بات کی شہادت تا قیامت دیتے رہیں گے کہ اُس دَور کے مسلمانوں کے نزدیک پاکستان کا مطلب کیا تھا۔۔۔۔ ایسے حضرات کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم "علیٰحدگی کی اسکیم قرآنی روشنی میں" کے نام لکھا گیا وہ مضمون قارئینِ طلوع اسلام کے سامنے لانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو جون 1940ء میں ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ اشاعت کے بعد یہ مضمون اُس دَور کے مسلمانوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ اسے ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے بار بار تقسیم کرنا پڑا۔ (ایڈیٹر)

اسلام کی حقیقت

عام طور پر مذہب سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ انسان کی "روحانی ترقی" کا ذریعہ ہے۔ یعنی اسے دنیا' جہان کے دھندوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ جب انسان دنیاوی بکھیڑوں سے فارغ ہو جائے تو کچھ وقت کے لئے اپنے خدا۔ ایشور۔ پرماتما کی طرف بھی دھیان کر لے۔ اس "دھیان" سے اس کے اندر ایک کیفیت پیدا ہو گی جسے آتما شکتی یا تسکینِ روح کہا جاتا ہے۔ اسی کی ترقی کا نام نجات یا مُکتی ہے۔ اس "تسکینِ روح" کے حصول کے ذرائع مختلف ہیں۔ ان ذرائع کو عبادت' بھگتی یا (Prayer) کہا جاتا ہے۔ کسی نے محرابِ مسجد کے اندر سر جھکا لیا' کسی نے مندر میں دیوی کی پوجا کر لی۔ کوئی گرجا میں چلا گیا۔ بس یہ ہے مذہب کا دائرہ اور یہ ہے اس کی کائنات ! جب انگریزوں نے اپنے تسلط کے بعد ہندوستان میں "مذہبی آزادی" کا اعلان کیا ہے تو ان کا مطلب بھی اسی آزادی سے تھا اور آج جب بساطِ سیاست انگریز کی طرف سے سمٹ کر ہندو کی طرف بڑھتی جا رہی ہے تو وہاں بھی مذہبی آزادی کا یہی مفہوم ہے۔ اور اسی کے تحفظات کی ضمانتیں دی جاتی ہیں۔ دوسرے مذاہب عالم میں مذہب کا جو تصور بھی ہو ہمیں اس سے واسطہ نہیں۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، مذہب کا مذکورہ صدر مفہوم قطعاً غلط ہے۔ اسلام یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک متعین ضابطہ قانون کے ماتحت چل رہی ہے اور اس میں ان کے ارادے اور اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ وہ مقررہ نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور اسی لئے یہ نظامِ کائنات ٹھکانے سے چلا جا رہا ہے۔ سو جب عالمِ موجودات کی ہر شے اس اصول پر

عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے' جو نظامِ کائنات کا ماحصل ہے' فطرت کے اس غیر متبدل قانون سے مستثنیٰ ہو گا؟ کیا اس کے لئے ضروری نہیں ہو گا کہ یہ بھی ایک متعین نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے! ظاہر ہے کہ انسان کو بھی اسی اصول کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہو گی۔ اس کو بھی ایک خاص نظام کے مطابق دنیا میں رہنا ہو گا۔ یہ نظامِ زندگی۔ یہ ضابطۂ قوانین۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اسلام کہلاتا ہے۔

لیکن انسان اور دیگر اشیائے فطرت میں ایک بین فرق ہے۔ دیگر مخلوق، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور و مقہور ہے جو ان کے لئے بطور نظامِ حیات تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس انسان کو کچھ اختیار اور ارادہ بھی دیا گیا ہے اور اس معاملہ میں اسے ایک حد تک آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی یہی آزادی اور اختیار ہے جو اسے دیگر مخلوق (مثلاً حیوانات وغیرہ) سے ممتاز کرتا ہے۔ اسے شعور و ادراک' عقل و دانش عطا کی گئی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اس نظامِ حیات کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ یہی امتیاز اس کی سرفرازی اور سربلندی کی دلیل ہے۔ اسی سے یہ دنیا میں اپنے آپ کو تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ تصور کرتا ہے اور بجا طور پر تصور کرتا ہے۔ اس اختیار کے ساتھ اپنے آپ پر جبر کرنا، اس آزادی کے باوجود اپنے آپ کو قوانین متعینہ کے دائرہ حدود و قیود میں پابند کر لینا' اس کے اندر جوہرِ خودی کا استحکام پیدا کرتا ہے اور یہی استحکام منشائے فطرت ہے۔ اس سے یہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منازل طے کرنے کے قابل ہو گا۔ اس سے اس میں وہ صلاحیت پیدا ہو گی کہ یہ اس زندگی سے اگلی زندگی' اس سے نفیس و لطیف زندگی' اس سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کر سکے' جسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔

لیکن انسان اپنے اس اختیار و ارادہ کو غلط بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس سے قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی بھی عمل میں آسکتی ہے۔ یہ اس نہج و اسلوب سے سرکشی بھی اختیار کر سکتا ہے جس پر چلنے کے لئے اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی اس سرکشی و تمرد' اس عدوان و طغیان کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس کے سمجھنے کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں (**فی انفسکم افلا تبصرون**) فطرت کا قانون ہے کہ آپ کی زندگی کا مدار سانس پر ہے۔ ذرا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ ناک اور منہ بند کر لیجئے' خود سمجھ میں آجائے گا کہ اس معصیت کا نتیجہ کیا ہے! **وقس علی هذا**۔ لیکن یہ حادثہ چونکہ آپکی مادی زندگی سے متعلق ہے جس میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں۔ اس لئے اس کا نتیجہ' اس کا انجام' اس کی جزا' محسوس طریق پر سامنے آجاتی ہے لیکن جب آپ اُن قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں جن کا تعلق آپ کی "انسانیت" سے ہے۔ جس کی حدیں حیوانیت سے آگے بڑھ کر شروع ہوتی ہیں تو اس کا نتیجہ غیر محسوس طور پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے جلدی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جھوٹ بولنا ایسی ہی فطرت کی قانون شکنی ہے جیسے سانس روک لینا۔ لیکن جہاں سانس روک لینے سے انسان کی جان پر بن جاتی ہے' وہ تڑپنے' پھڑکنے' بلبلانے لگ جاتا ہے' جھوٹ بولنے سے وہ محسوس ہی نہیں کرتا کہ اسے کوئی تکلیف ہوئی ہے۔ لیکن وہ محسوس کرے یا نہ کرے نتیجہ تو برآمد ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں جن کا مجموعی اثر انسان کی تمدنی' عمرانی' معاشرتی' معاشی' اخلاقی' سیاسی' دینی' دنیاوی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا ہے اور انسان کی حیاتِ اجتماعیہ کو انہی نتائج و عواقب کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر اس کی زندگی قوانینِ فطرت کے مطابق ہے تو اس کا فطری نتیجہ ہے کہ اس کی حیاتِ اجتماعیہ فردوس در آغوش ہو اور اگر اس کی زندگی ان قوانینِ فطرت کے خلاف بسر ہو رہی ہے تو وہ عدم طمانیت و فقدانِ سکون کے شعلہ بار جہنم میں جل رہا ہے۔ جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔

لہٰذا اس دنیا میں جنت کی زندگی، سکون و طمانیت کی زندگی کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حیاتِ انسانی کو ان قوانین کے ماتحت چلایا جائے جس پر چلنے کے لئے وہ مخلوق ہوئی ہے۔ یعنی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وہ نظام جسے اسلام کہا جاتا ہے۔ انسان کو اس نظام پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تو وہ ضابطۂ قوانین موجود ہو۔ جس کے مطابق اسے چلایا جائے گا اور دوسرے کوئی ایسی قوت موجود ہو جس کی بنا پر انسان کو ان قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے دی جائے۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے۔ "ہدایتِ خداوندی" اور اس قوت کا نام ہے "حکومتِ الٰہی" یا خلافتِ ارضی۔ فرمایا

"یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین (کتاب) اور میزانِ عدل نازل کی۔ تاکہ نوع انسانی توازن پر قائم رہے اور ہم نے (ان چیزوں کی محافظت کے لئے) فولاد (کی شمشیر) بھی نازل کی۔ جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کیلئے منفعت۔ تاکہ اللہ یہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحب قوت و تدابیر ہے"

(57/25)

یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اس نظامِ خداوندی میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے کہ ایک طرف انسان کو آزادی اور اختیار کی نعمت سے سرفراز کیا جائے اور دوسری طرف اس "جبر" سے اس نعمت کو واپس لے لیا جائے۔ ہم یہ بحث کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ کسی اندھے کو کنویں میں گرنے سے زبردستی روک لینا اس پر زیادتی نہیں ہے۔ کسی بچے کے ہاتھ سے بزور چاقو چھین لینا اس پر ظلم نہیں کہلا سکتا۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کر کے اس کے اس اختیار کو اس سے سلب کرنا ناانصافی نہیں ہے۔ کسی جاہل اور ظالم انسان کے لئے قوانینِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دینا یقیناً جور و تعدی نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ یہ تو اس کے ساتھ عین انصاف ہے۔ انصاف ہی نہیں۔ احسان بھی ہے۔ جب تقویمِ انسانیت کے نظم و نسق کا اسلوب و انداز یہ ٹھہرا۔ تو ضروری ہے کہ نوعِ انسانی میں ایک ایسی جماعت موجود رہے جو ضابطۂ خداوندی کی وارث اور اس نظم و نسق کے قیام و بقا کی ذمہ دار ہو اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ جماعت صاحبِ قوت و اقتدار بھی ہو۔ کہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ چنانچہ ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ رشد و ہدایت شروع کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی التزام رکھا کہ اس جماعتِ منتخبہ کو جو ضابطۂ قوانین کی وارث ہو، خلافت ارضی کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا جائے۔ سورۂ اعراف میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جہاں حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے سلسلۂ تعلیم کا ذکر ہے، وہاں ان کی اقوام کے متعلق یہ بھی تصریح موجود ہے کہ انہیں قوت و اقتدار اور سطوت و حکومت بھی عطا فرمائی گئی تھی۔ انبیاء علیہم سابقہ میں حضرت ابراہیمؑ کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انہیں کتاب و حکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" کا بھی مالک بنایا گیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کے تمکن فی الارض کی صراحت سورۂ یوسف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کی کشور کشائی و جہاں بانی کی شہادتیں قرآنِ کریم کے ورق ورق سے ملتی ہیں۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس نہج سے جاری رہا کہ یہ انبیاء کرام کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔ ان کا ضابطۂ ہدایت کچھ وقت کے لئے محفوظ رہتا، پھر اس کے جدید اڈیشن کی ضرورت پڑ جاتی۔ اسی طرح ان کی قوم بھی ایک خاص وقت تک حاملِ کتابِ الٰہی رہتی، اس کے بعد اس کی مخاطب کوئی دوسری قوم ہو جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ تاآنکہ انسانیت ارتقائی منازل طے کر کے

عہدِ شعور تک پہنچ گئی۔ یہ اب اس قابل ہو گئی کہ اسے ایک ایسا ضابطۂ الٰہی دیدیا جائے جس میں کسی تغیر و تبدّل کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ تمام نوع انسانی کو اپنا مخاطب قرار دے۔ جس کا دائرہ نفوذ کوئی خاص خطۂ ارض نہ ہو۔ بلکہ اس کی حدیں ابدیت سے ہم کنار ہوں۔ یہ وقت آیا تو خدائے رب اللعالمین کی طرف سے وہ رسولؐ للعالمین مبعوث ہوئے جنہوں نے آکر تمام نوع انسانی سے کہا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا - (۷/۱۵۸)

"اے نوع انسانی۔ میں تم تمام کی طرف اللہ کا پیام لیکر آیا ہوں۔"

اور یہ اعلان صرف اس زمانے کے انسانوں کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ ان کے لئے بھی تھا جو ان کے بعد دنیا میں آنے والے تھے۔ **وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۳)**

اس نے اللہ کی اس کتاب کو نوع انسانی تک پہنچایا۔ جس کی تعریف یہ تھی کہ

ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ تمام دنیا کے لئے نصیحت

اس ضابطۂ الٰہی کی وراثت کے لئے نوع انسانی میں سے ایک خاص جماعت کو منتخب کیا گیا۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ (35/32)

"پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کیلئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا۔"

اور اس جماعت کو قوانینِ خداوندی کی حفاظت و تنفیذ کے لئے حکومت و مملکت کی شمشیرِ خارا شگاف (حدید) سے بھی متمتع فرمایا۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۝ (33/27)

"اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی جہاں تمہارے ابھی قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قدرت اور اختیار رکھتا ہے"۔

اور اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی فرما دیا کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا کہ تمہیں یوں سطوت و شوکت حاصل ہو گئی۔ بلکہ یاد رکھو کہ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ یہ فطرت کا غیر متبدل قانون ہے۔

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں۔ اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا۔ جس طرح ان سے پیشتر اس نے (ان شرائط کو پورا کرنیوالوں کو) حکومت عطا فرمائی تھی اور ان کے اس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے تمکن کر دیگا اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا۔ (تاکہ) وہ صرف میرے ہی محکوم ہوں اور میری (حکومت) میں کسی اور کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد ناسپاس گزار ہو گا تو اس کا شمار فاسقین میں سے ہو گا۔" (سورہ نور۔ رکوع نمبر 7)

اس جماعت کو کتاب و حکومت کا وارث بنانے کے بعد بتا دیا کہ ان کا فریضۂ حیات کیا ہے۔ فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)

"تم وہ بہترین قوم ہو جو تمام نوع انسانی کی (ہدایت) کی خاطر پیدا کی گئی ہو (تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ) تم قوانینِ الٰہیہ (معروف)(۱) کا حکم کرو اور ان لوگوں کو اس کے خلاف دوسری باتوں (منکر)(۲) سے روکو۔"

نمبر1 معروف کا ترجمہ بالعموم نیکیاں اور نمبر2 منکر کا ترجمہ برائیاں کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے نیکی وہ ہے جس کا قرآن حکم دے اور برائی وہ جس سے وہ روکے۔ نیکی اور بدی کا یہی ایک معیار ہے۔ اس لئے ہم نے ان الفاظ کا ذرا واضح ترجمہ کیا ہے۔

دیکھئے ! یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو امور معروف کے متعلق وعظ و نصیحت کرو۔ بلکہ فرمایا کہ تم ان باتوں کا حکم دو (تامرون) اور ظاہر ہے حکم وہی دے سکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے ملّتِ اسلامیہ کا فریضۂ زندگی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس مذہب سے حکومت کو الگ کر دیا جائے تو باقی وہی کچھ رہ جاتا ہے۔ جو انگریز اور ہندو نے مذہب کا مفہوم سمجھا ہے۔ یعنی ایشور بھگتی۔ خدا کی پوجا۔ گرجا کی (Prayer) عبادات و رسومات۔ لیکن یہ اسلام تو نہیں رہے گا۔ خلافت ارضی کے بغیر اسلام کا تصور ہی باطل ہے اور مسلمان کہلاتے ہوئے کسی اور کا محکوم ہونا اور اس محکومیت پر قانع ہو جانا عملی شرک ہے۔ پس جس طرح ضابطۂ خداوندی سے الگ ہو کر حکومت محض فرعونیت رہ جاتی ہے، اسی طرح "عصا" کے بغیر "کلیمی" بھی رہبانیت بن جاتی ہے۔ فرعون کی مملکت اور حضرت موسیٰؑ کا ضابطۂ شریعت۔ ان دونوں کا نام ہے۔ اسلام۔ وہ اسلام جو اپنی کامل و مکمل شکل میں اس وقت ظاہر ہوا جب وہ مثیلِ موسیٰؑ وہ دعائے خلیلؑ وہ نویدِ مسیحؑ دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی وادیوں میں بایں شان و جلال جلوہ پیرا ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں شمشیر تھی۔ تمام ملک میں قوانینِ الٰہیہ کا سکہ جاری تھا۔ خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ تھی۔ اس وقت اس نے پکار کر کہا۔ کہ ہاں۔

ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السموات والارض (اوکما قال علیہ السلام۔ بروایت ابوبکرہ)

آج زمانہ پھر پھرا کر وہیں آگیا، جہاں یہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت تھا۔ یعنی ہر شے قوانینِ فطرت کے مطابق عمل پیرا ہو گئی۔

یہ ہے اسلام۔ جس میں زمامِ حکومت انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ خود اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس کا فرمان ہے۔ کہ

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکومت صرف اللہ کیلئے ہے اور بس۔

لہٰذا اس حکومت کو نہ (انسانوں کی وضع کردہ) دستوری شہنشاہیت (Monarchy) سے کچھ واسطہ ہے نہ خود مختار ملوکیت (Autocracy) سے۔ نہ جمہوریت (Democracy) سے کچھ علاقہ ہے، نہ آمریت (Dictatorship) سے۔ نہ اس میں قوانین وضع کرنے کا اختیار اکثریت کے ہاتھ میں رہتا ہے، نہ کسی ہائی کمانڈ کی تفویض میں۔ اس جماعت کا کام جو اس حکومت الٰہیہ کے قیام و بقا کی ذمہ دار ہوتی ہے، قوانینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج اور ان اصولوں کی روشنی میں فروعات کی ترتیب و تدوین ہوتا ہے اور بس۔ اگر مسلمان کو اس قدر آزادی حاصل ہو تو پھر اس کا مذہب آزاد ہے۔ ورنہ نماز روزہ کی آزادی بے معنی ہے۔ آزادی وہی ہے جس میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو سکے اور حکومت بھی ایسی مستقل بالذات کہ داخلی اور خارجی تمام امور متعلقہ میں کسی دوسری طاقت کا دخل و اثر نہ ہو۔ اس لئے کہ حکومت الٰہیہ میں انسانی قوت و اقتدار کا امتزاج تو ایک کھلا ہوا شرک ہے۔ پھر اس حکومتِ الٰہیہ کے قوانین کی رُو سے انسانوں کی تقسیم۔ عام انسانی معیار تفریق و تمیز یعنی لسانی، نسلی، جغرافیائی حدود کے برعکس، ایک جداگانہ معیار کے مطابق طے پاتی ہے۔ یعنی وہ

تمام انسان جو اس حکومت اِلٰہیہ کے دائرہ میں آتے جائیں (بالفاظِ دیگر اسلام قبول کرتے جاتے ہیں) وہ بلا لحاظ نسل، رنگ، وطن، ایک بنتے جاتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں تمام دوسرے انسان ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں۔ اوّلُ الذکر جماعت کو ملّتِ اسلامیہ، جماعت مومنین کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر غیر مسلم، جمیعتِ کفار کہلاتے ہیں۔ جس طرح کسی حکومت کے کاروبار میں کسی ایسے شخص کو باریابی نہیں ہو سکتی، جو اس حکومت کا باغی ہو اسی طرح حکومت اِلٰہیہ کے نظم و نسق میں کسی غیر مسلم کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مسلمانوں کے امور حکومت (**شُوْرٰی بَیْنَھُمْ**) انکی آپس کے باہمی مشورہ سے طے پا سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ان کا صاحب امر بھی لامحالہ انہی میں سے ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کہ اولی الامر منکم (تم میں سے) کی شرط لاینفک ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں اسلام کے عناصرِ ترکیبی اور اصول و مبانی۔ انہیں پیش نظر رکھئے اور ان کی روشنی میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل پر غور کیجئے۔ بات خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔

سیاستِ ہندیہ اصول بالا کی روشنی میں

صفحات گذشتہ میں ہم نے اسلام و مسلمانوں کے متعلق جو کچھ حقائق قرآنی کی روشنی میں لکھا ہے، اس کی صحت میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب حقیقت وہی ہے، جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان جس حالت میں آج ہے وہ صرف نام کا مسلمان ہے۔ اپنی حکومت کے بغیر یہ کبھی صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جن حالات میں ہم یہاں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہم اس "عہد جاہلیت" سے "عہد اسلامی" کی طرف کیسے آسکتے ہیں۔ مسئلہ زیر نظر کا حل ایک بڑی حد تک اسی سوال کے صحیح جواب پر موقوف ہے اور اس لئے دِقّتِ نظر کا طالب۔ اس مقصد کے لئے ذیل کی چند اہم شقوں کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

(1) ہندو کا دعویٰ ہے (اور ہم اس وقت اس دعویٰ کی حقیقت پر بحث نہیں کرنا چاہتے) کہ تحریکِ آزادی سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مسلمان کسی کا محکوم رہ کر صحیح معنوں میں مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جہاں تک انگریزوں کی (یا کسی اور کی) حکومت کا تعلق ہے، مسلمان از روئے قرآن اس امر پر مامور ہے کہ اس غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ لہٰذا اس شق میں مسلمان ہندو سے بھی زیادہ اس امر کا متمنی ہے کہ غلامی کا طوقِ لعنت اس کی گردن سے اُتر جائے۔

(2) ہندو کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان ایک واحد ملک ہونے کی جہت سے ایک "کل (Unit)" ہے اور اس میں بسنے والے تمام انسان ایک "قوم" ہیں۔ موجودہ نظامِ حکومت کے بعد جدید طرزِ حکومت (یعنی دورِ آزادی کا طرزِ حکومت) جمہوری ہو گا۔ یعنی جملہ امور کے فیصلے اس مزعومہ "قوم" کے نمائندوں کی اکثریت سے طے پائیں گے اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اکثریت یہاں بہرحال ہندوؤں کی ہو گی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

(3) ہندوستان کے مستقبل کے آئینی نظام کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انگریزوں کے زیر سایہ درجہ نوآبادیات (Dominion Status) مل جائے (ہندو یہی چاہتا ہے) اور دوسرے یہ کہ انگریزوں کے عمل و دخل کے مکمل

انقطاع کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے (قرائن و شواہد اس پر دال ہیں کہ ہندو یہ نہیں چاہتا) دونوں صورتوں میں سے کوئی شکل بھی پیدا ہو، ہندو کے ارادوں کے مطابق نظامِ حکومت کی تشکیل یوں ہو گی کہ تمام ہندوستان کا ایک مرکز (Centre) ہو گا اور تمام اہم شعبہ ہائے نظم و نسق کے اصول اس مرکز سے متعین ہوں گے۔ اور جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت یہ فیصلے اکثریت کی آراء کے تابع ہوا کریں گے۔

(4) اس نظام حکومت میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" دی جائے گی۔ یعنی اس چیز کی آزادی جسے ہندو "مذہب" سمجھتا ہے۔ بعینہٖ جیسے آج کل انگریزوں کی حکومت میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" حاصل ہے۔ یعنی اس چیز کی آزادی جسے انگریز "مذہب" سمجھتا ہے۔ نماز روزہ کی آزادی۔ مدح صحابہ و تبریٰ کی آزادی۔ عرسوں کی آزادی۔ تعزیہ کی آزادی۔ قرآن پڑھ پڑھ کر اس کے ایصال ثواب کی آزادی۔ سوا لاکھ مرتبہ آیت الکرسی پڑھنے کی آزادی۔ ڈاڑھی بڑھانے کی آزادی۔ ختنہ کی آزادی۔ عقیقہ کی آزادی۔ غرضیکہ پوری "مذہبی" آزادی ہو گی۔ البتہ امور دنیاوی کے فیصلے اکثریت کے ماتحت ہوں گے۔ یعنی ملک میں (جس میں مسلمان بھی شامل ہیں) اقتصادی نظام کیسا ہو گا۔ سودی کاروبار کی نوعیت کیا ہو گی۔ دولت اور زمین کی تقسیم کیسے ہو گی۔ بیرون ہند کی اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ امن و جنگ کی حالت میں تعلقات کیسے ہوں گے۔ صلح کس سے ہو گی اور دشمنی کس سے۔ عدالتوں کا نظم و نسق کیسے ہو گا۔ ترازوئے عدل و انصاف کی تفویض کس معیار پر ہو گی۔ کسی فعل کو جرم قرار دئے جانے کا تعین کون کرے گا۔ جرائم کی سزا کیا ہو گی۔ غرضیکہ اس قسم کے تمام "امور دنیاوی" کے فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہونگے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نظامِ حکومت میں مسلمانوں کی حالت کیا ہو گی! کیا وہ اس نہج زندگی میں اپنے آپ کو "آزاد مسلمان" (بلکہ یوں کہئے کہ صحیح معنوں میں مسلمان) کہلانے کے مستحق سمجھیں گے؟ اس کے برعکس مسلمان کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ

(1) از روئے کتاب و سنت۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوستان کے تمام باشندے ایک "قوم" نہیں ہیں۔

(2) تمام ہندوستان کو ایک "کل" (Unit) فرض کر کے جمہوری انداز کا طرز حکومت مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا، کہ مسلمان کا نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام و بقا ہے۔ جو اس کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہو۔ "دین و دنیا" کی تفریق اس کے نزدیک غیر اسلامی نظریۂ حیات ہے۔

☆

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ تمام ہندوستان کو ایک "کل" (Unit) اور یہاں کے تمام باشندوں کو ایک قوم تصور کر لینے کے بعد جس انداز کا نظامِ حکومت ہندو قائم کرنا چاہتا ہے، وہ مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے ناقابل قبول ہے تو پھر۔ بحالات موجودہ مسلمان کس انداز کا نظام حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے لئے دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اس وقت جب نظامِ حکومت انگریزوں کی زیرِ سرکردگی درجۂ نوآبادیات کا ہو۔ (جیسا کہ سردست حالات بتا رہے ہیں) اور دوسرا اس وقت جب نظامِ حکومت بالکل آزاد ہو۔ (جو مسلمانوں کا ازروئے مذہب منتہائے نگاہ ہے۔) مسلمان چاہتا ہے۔ کہ اولذکر صورت میں یہاں دو (یا دو سے زیادہ) الگ الگ مراکز (Centres) قائم کئے جاویں۔ ایک ہندو انڈیا کے لئے اور دوسرا مسلم انڈیا کے لئے۔ یعنی ایک مرکز میں اکثریت ہندوؤں کی ہو اور دوسرے مرکز میں مسلمانوں کی اور ثانی الذکر صورت میں ہندوستان کے دو الگ الگ خطوں میں جداگانہ آزاد سلطنتیں قائم ہوں۔ یہ ہے مسلمانوں کا مطمع نگاہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نظریہ کی عملی تشکیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اتفاق سے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی (بنگال آسام) کے

علاقوں میں دو بڑے خطے ایسے واقع ہوئے ہیں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ اگر ہندوؤں اور انگریزوں کے نظریات کے مطابق اکثریت کو یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ اپنا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں رکھے تو اس حصہ ملک کی اکثریت سے یہ حق کیوں سلب کر لیا جائے؟ مسلم لیگ کی تجویز یہ ہے کہ جس دوران میں ملک میں آئینی تبدیلیاں ہوں، ان خطوں میں ایک (یا دو) جداگانہ مرکز قائم کر کے مسلمان اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے اور جب مکمل آزادی حاصل ہو جائے تو یہی علاقہ آزاد اسلامی حکومت کی جولانگاہ بن جائے۔ اولاالذکر اسکیم۔ مسلم لیگ کے ریزولیشن (لاہور) کا ماحصل ہے اور ثانی الذکر ہمارے تصورات کی آماجگاہ۔ اول الذکر بھی درحقیقت اسی ثانی الذکر کا پیش خیمہ ہے) اور دونوں کا سرچشمہ اس مرد حق بین و حق آگاہ کی دانش نورانی و حکمت برہانی کا رہین منّت ہے۔ جس نے 1930ء میں الٰہ آباد کے مقام پر پوری جرأت و بسالت سے اس کا اعلان فرمایا۔ نوّر اللہ مرقدہٗ ورفع اللہ مقامہٗ

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

☆

اعتراضات

ہندوؤں کی طرف سے اس اسکیم کی مخالفت ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی (اقبالؒ)

انہوں نے اس کے خلاف جس قدر ہنگامہ آرائی اور غوغا ژائی سے کام لیا وہ کوئی غیر متوقع اور تعجب انگیز واقعہ نہیں۔ تعجب تو بلکہ اس پر ہوتا اگر وہ خاموش رہتے۔ ہندو کی تمام جدوجہد اس امر کے حصول کے لئے ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر ہندو راج قائم کر کے اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمان اور تنہا مسلمان سے لے۔ اس نے جب دیکھا کہ اس اسکیم کی رُو سے اس کے یہ تمام منصوبے خواب پریشاں ہو رہے ہیں تو وہ تلملا اٹھا اور اپنی قدیم روش کے مطابق "لوٹ لیا' مار لیا' دوڑیو۔ بچائیو"۔ کے شور سے ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا کہ جس سے واٹسرائے لاج سے لے کر قصر بکنگھم تک کی دیواریں ہل جائیں۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اور اس کا کوئی گلہ نہیں ہے شکوہ نہیں۔ لیکن جس بات کا رونا ہے وہ اس سے الگ ہے۔ جس قیامت کا ماتم ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ مصیبت یہ نہیں کہ ہندو اس کی مخالفت میں یوں آتش در پیرہن کیوں ہو رہا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ سب مخالفت خود غلام فطرت مسلمانوں کے ہاتھوں سے کرائی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو جو زخم غیروں کے ہاتھوں سے لگ رہے ہیں تکلیف ان کی بھی ہوتی ہے۔ کہ زخم بالآخر زخم ہے۔ لیکن قیامت تو اس وقت برپا ہوتی ہے جب یہ دکھائی دے کہ جس ہاتھ میں خنجر ہے وہ ہاتھ ایک مسلمان کا ہے۔ حضرت عمرؓ کو جب بحالتِ نماز زخمی کیا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے یہی دریافت فرمایا تھا کہ حملہ آور کون ہے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان نہیں تو سجدۂ شکر بجا لائے۔ کہ الحمد للہ میرا قاتل کوئی مسلمان نہیں۔ لہٰذا جب یہ دیکھا جائے کہ ملت کی رگِ جاں پر جو خنجر رکھا جا رہا ہے وہ خنجر ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے تو اندازہ فرمایئے کہ یہ منظر کس درجہ کرب انگیز اور یہ حادثہ کیسا جانکاہ ہو گا اور پھر یہ ننگِ اسلام "مسلمان" اس مخالفت میں چاروں طرف سے اس طرح یورش کر کے امنڈے ہیں گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر دے مارا ہو۔ اُن کی اِن

ہنگامہ خیزیوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جب قرآن کریم نے فرمایا تھا۔ کہ

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۷۲/۱۹)

"جب اللہ کا بندہ ان لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینے کے لئے کھڑا ہوا تو مخالفین نے اسے یوں چاروں طرف سے گھیر لیا کہ گویا ابھی اسے لپٹ جائیں گے"۔

تو یہ صرف کسی خاص واقعہ کا ہی بیان نہ تھا بلکہ ایک حقیقتِ مستمرہ کا اظہار تھا کہ جب اور جہاں کہیں کوئی اللہ کا بندہ اسلام کی سرفرازی و سربلندی کی طرف دعوت دیتا ہے تو مخالف قوتیں اسی طرح ہجوم کر کے اسے گھیر لیتی ہیں۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات (اقبالؒ)

اور پھر قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس لشکرِ بلا انگیز کا مقدمتہ الجیش مشتمل ہے ان حضرات پر جو بڑے بڑے جُبّوں اور عماموں سے آراستہ' طویل اور عریض عباؤں اور قباؤں سے مزیّن' پشت پر کتابوں کا طُو مار اٹھائے' بغلوں میں (قرآن نہیں بلکہ قرآن کے جزدان) دبائے۔ حمایتِ دین اور حفاظتِ اسلام کے نعرے لگاتے اس "ملحد و بے دین" کے تعاقب میں بڑھے جا رہے ہیں جس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہی ہیں وہ قالب کہ جنہیں جعفر اور صادق کی روحیں تلاش کر کے اپنا نشیمن بنا لیتی ہیں۔ یہی ہے وہ طائفہ کہ جس نے اپنے زُہد و تقدس اور علم و فضل کی نظر فریب قباؤں میں وہ خنجر و سناں چھپا رکھے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کا پُر نور سینہ جن سے ہمیشہ چھلنی ہوتا رہا ہے۔

ہمیں اس تلخ نوائی سے معاف رکھئے کہ جب قرآن کو ڈھال بنا کر مسلمان کے سینہ میں خنجر گھونپا جاتا ہے تو منہ سے بے اختیار چیخ نکل جانا کوئی جرم نہیں۔ آہ! ہم اپنا سینہ کسے دکھائیں اور کس سے ان رستے ہوئے ناسوروں کی مرہم طلب کریں جو خود چارہ ساز کے نشتر کے رہینِ منّت ہیں۔ بھڑک اٹھنے والی آگ کو تو ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن اس آتشِ خاموش کو کوئی کیسے دکھائے جو اندر ہی اندر مغزِ استخوان تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دے اور اس کا دھواں تک بھی سطح سے اُبھرنے نہ پائے۔ ہم جب بھی اپنے بھائیوں کے خلاف کچھ لکھتے ہیں تو شاید یہ سمجھا جاتا ہو کہ ہمیں اس میں کچھ لطف آتا ہے۔ لیکن ہم کسے اپنا دل چیر کر دکھائیں کہ اس قسم کے شکوہ و شکایت سے خود ہم پر کیا گذرتی ہے۔ یقین مانئے ہم ہر بات کو دیکھتے ہیں اور چھاتی پر پتھر رکھ کر اسے برداشت کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ایسی اصلاح کی صورت نکل آئے کہ ہمیں حرفِ شکایت زبان پر لانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن جب پانی سر سے گزر جاتا ہے' جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کشتی کے مسافر خود اپنے ہاتھوں سے کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں' اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم چندے خاموش رہے تو پوری کی پوری کشتی غرق ہو جائے گی۔ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ گھر کے بسنے والے خود اپنے ہاتھوں سے گھر کو تباہ کر رہے ہیں **يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ** (59/2)۔ اور خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے ان کا ہاتھ نہ پکڑا تو یہ بنیادوں تک کو منہدم کر دیں گے تو اس وقت ہم زبان کھولنے اور ہاتھ پکڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں (اور بطور تحدیثِ نعمت عرض کرتے ہیں کہ ایسے وقت میں کسی ترغیب یا ترہیب' کسی مصلحت کوشی یا جنبہ داری کے کانٹے آج تک ہمارے دامن کو نہیں الجھا سکے۔ یہ صرف اسی کا کرم ہے جسے وہ نوازے) ہم بھی جانتے ہیں کہ عفو در گزر' مسامحت اور چشم پوشی اچھے اخلاق ہیں لیکن جب آپ دیکھ رہے ہوں کہ ایک شخص مکان میں آگ لگا رہا ہے تو اس وقت دیکھتے رہنا اور اس کا ہاتھ نہ روکنا' دنیا کے کسی معیار کے مطابق بھی مستحسن قرار نہیں دیا جائے گا۔ قومیں تباہ اس

وقت ہوتی ہیں جب انہیں غلط راستہ سے ٹوکنے والا کوئی باقی نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں مختلف امیال و عواطف کا تقاضا بیشک کچھ اور ہوتا ہے لیکن فریضۂ خداوندی کچھ اور چاہتا ہے اور مبارک ہیں وہ کہ ایسے وقت میں جن کے ادائیگی فرض کے راستہ میں مختلف رجحانات مزاحم نہ ہو جائیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط (۵/۵۴)

یقین مانئے۔ نہ ہمیں اشخاص سے کچھ تعلق ہے' نہ جماعتوں سے کچھ واسطہ۔ ہماری موافقت ہے تو اور مخالفت ہے تو سب ایک اصول کے ماتحت ہے اور وہ اصول۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ صرف ایک ہے۔ کہ موافقت اس کی جو حق پر ہو اور مخالفت اس کی جو اس راہ کو چھوڑ کر باطل کے پیچھے لگ جائے۔ اگر عوام اس باطل کے راستے پر لگ جائیں تو زیادہ خدشہ نہیں ہوتا کہ ایک تو عوام کا فعل ان کی ذات تک محدود رہتا ہے اور دوسرے انہیں ہر وقت راہِ راست کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کشتی کے ناخدا ہی اسے بھنور کی طرف دھکیل لے جائیں جب انجن کا ڈرائیور ہی اسے پٹڑی پر سے اُتار دے تو پھر ہلاکت سے بچنے کی کونسی شکل باقی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ایسے وقت میں خطرہ سے آگاہی کے ناقوس کا زیادہ بلند آہنگ اور روکنے والے ہاتھ کی گرفت کا زیادہ شدید ہو جانا بالکل فطری ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ ○ (۵۰/۳۷)

اور یقیناً اس میں عبرت ہے اس کے لئے جو (سینہ میں) دل رکھتا ہو اور اسے کان دیکر سنے اور اس پر گواہ رہے۔

☆

اعتراض اول اب آیئے اعتراضات کی طرف۔ جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس اسکیم کا نقطۂ ماسکہ پنجاب ہے۔ کہ پنجاب ہی اس اسلامی خطہ کا قلب ہو گا۔ پنجاب کا مسلمان اس خواب کی تعبیر کے لئے ہمہ تن اضطراب ہے اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار۔ پنجاب کے مسلمان کے سینہ میں دل اور دل میں زندہ رہنے کے ولولے موجزن ہیں۔ اس کی رگوں میں خون اور خون میں ایمان کی حرارت ہے وہ زندہ ہے۔ متحرک ہے۔ بیتاب ہے ایک پیکرِ جذبات ہے جو تحفظِ ناموسِ اسلام کی خاطر ہر وقت کٹ مرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کا سیاسی شعور ہنوز اتنا بیدار نہیں ہوا کہ وہ اپنی نمائندگی کے لئے ایسے مسلمان منتخب کرے جن میں یہی جذبات بدرجہ اولیٰ موجود ہوں۔ اس لئے عام طور پر وہ بساطِ سیاست پر دھوکا کھا جاتا ہے اور اس کا بری طرح خمیازہ بھگتتا ہے۔ اسکیم زیرِ نظر کی جلد از جلد کامیابی کے لئے پنجاب کا ذرہ ذرہ مضطرب و بے قرار ہے۔ لیکن اس کمی کی وجہ سے جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے باہر کی دنیا یہ سن کر متعجب رہ گئی کہ اس کی مخالفت کی ابتدا بھی پنجاب ہی سے ہوئی اور وہ بھی خیر سے وہاں کے وزیراعظم کی زبان سے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدبختی کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی "زبان" اس کے "قلب" کی مخالفت پر اُتر آئے۔ یہ اسکیم ابھی لیگ کے اربابِ بست و کشاد کے طبقہ میں گردش کر رہی تھی اور اسے اپنی آخری صورت میں 24 مارچ 1940ء کو لاہور کے کھلے اجلاس میں جلوہ پیرا ہونا تھا کہ اوائل مارچ میں جناب سر سکندر حیات خاں صاحب نے اسلامیہ کالج کے ایک جلسہ کی تقریب پر طلباء کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ تم نے کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشا یہ ہو کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کر لیا جائے۔ یہ اسکیم نہ صرف اسلامی تعلیم کی صحیح روح کے ہی خلاف ہے بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے بھی منافی ہے جس کی رُو سے ہر فرزندِ توحید پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچا دے۔ (ہندوستان ٹائمز (05-03-1940)

یہاں سے ابتداء ہوئی اور اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ قومیت پرست طبقہ بالخصوص احرار اور جمعیت العلماء کی

طرف سے ہر چہار سمت سے یہی مصرع اٹھایا گیا۔ کہ ہاں! یہ اسکیم اسلام کے خلاف ہے لیکن حرام ہے جو اسوقت تک سر سکندر حیات خاں صاحب یا ان کے مقلدین میں سے کسی اور نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی ایک دلیل بھی پیش کی ہو۔ گویا یہ ایک فتویٰ تھا جو بلا دلیل و حجت بارگاہِ وزارت سے صادر ہو گیا اور اس کے نیچے حضرات "علماء کرام" "الجواب صحیح" لکھ کر مہر تصدیق ثبت فرماتے گئے۔ ہم نے باب اول میں جو کچھ لکھا ہے اسے ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ فرمایئے کہ کیا اس سے بڑا جھوٹ بھی ہے جو کبھی بولا گیا ہو اور اس سے بڑی تہمت بھی ہے جو اسلام پر لگائی گئی ہو کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا خیال اسلام کے خلاف ہے۔ حیرت ہے کہ اگر مسلمان کی حکومت کا تصور اسلام کے خلاف ہے، تو پھر کیا غلامی کا نظریہ اسلام کے مطابق ہو گا۔ یہ حضرات جو کچھ ان کے جی میں آتا اس اسکیم کے خلاف کہتے۔ لیکن کم از کم اللہ کے دین کے خلاف اس کے پیام ازلی کے خلاف۔ اس کے ضابطۂ حکومت کے خلاف تو اس دیدہ دلیری سے کام نہ لیتے۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان پر اس لئے بھی اللہ کا عذاب طاری ہے کہ اس کی کتابِ عظیم کو (نعوذ باللہ) کھلونا بنا رکھا ہے۔ ہر شخص اپنے خیالات و خواہشات کی اتباع کرتا ہے لیکن چاہتا یہ ہے کہ اسے قرآن کریم کے مقدس غلاف میں لپیٹ کر پیش کرے تاکہ ہر سننے والے کا سر خود بخود اس کے سامنے جھک جائے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا "تلعب بالدین" اللہ کے ہاں کسی رعایت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ہم چیلنج دیتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کوئی صاحب آگے بڑھیں اور اپنے اس دعویٰ کے اثبات میں قرآنِ کریم کی کوئی ایک آیت پیش کریں۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ یونہی کہہ دینا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ سوائے فریب دہی کے اور کیا ہے! معلوم ان لوگوں نے دین کو سمجھ کیا رکھا ہے کہ جس کے جی میں جو کچھ آئے۔ کہتا چلا جائے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں! اس میں شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں کے پاس کوئی ایسی قوت موجود نہیں۔ جس کی بنا پر وہ ان لوگوں کو مجبور کر سکیں کہ یہ اپنے دعوے کو قرآنی دلائل سے ثابت کریں۔ لیکن انہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ آخر ایک دن خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں کیا جواب بن پڑے گا! اللہ اکبر! انسان بھی کس قدر ظلوماً جھولا (ظالم و جاہل) واقع ہوا ہے۔ اگر ان لوگوں کا دعویٰ صحیح مان لیا جائے تو پھر قرآن کی رو سے (معاذ اللہ) اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہو گی کہ مسلمان ریت کے ذروں کی طرح بکھرا پڑا رہے کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے اپنے ساتھ اُڑا کر اور پانی کی ہر تیز رو اپنے ساتھ بہا کر لیجائے۔ ان ذرات کا سمٹ کر ایک چٹان بن جانا کہ جو مخالف قوت اس سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے، خلافِ اسلام ہو گا۔ ان کا اسلام انہیں یہ سکھاتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ذلت و خواری نکبت و زبوں حالی۔ بے کسی و بے بسی۔ غربت و افلاس کی زندگی بسر کر کے گونڈ اور بھیل بن کر رہ جائیں۔ یہ تو گویا عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر انہیں سرفرازی و سربلندی۔ عزت و وقار۔ شوکت و سطوت۔ عظمت و حکومت کی زندگی مل سکے تو یہ سب کچھ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ غیر مسلم اکثریت کے ماتحت دن بسر کر کے شودروں کی زندگی بسر کریں۔ یہ تو ان حضرات کے نزدیک عین مقصودِ اسلام ہے۔ لیکن ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک ذی عزت قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا یکسر غیر اسلامی زندگی ہے! اللہ اکبر۔ یہ ہے ان لوگوں کا قرآن اور یہ ہے اس قرآن کی تعلیم۔ جو قرآنِ کریم چودہ سو برس سے مسلمانوں کے ہاں چلا آتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک (نعوذ باللہ) ناقص ہے کہ وہ مسلمانوں کو عزت کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کا طریق

(اقبالؒ)

اسکیم زیر نظر میں ابھی یہ شق کہیں لازم نہیں رکھی گئی کہ ملک کے جن حصوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں- وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر (کہ جہاں انہیں غیروں کی محکومیت میں زندگی بسر کرنا پڑے) اسلامی خطۂ ملک میں آجائیں لیکن اگر ان معترضین کے سامنے وہ قرآن ہوتا جو نبی صلعم پر نازل ہوا تھا تو اس میں تو یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے کہ تمہارے دین اور وطن میں آویزش ہو جائے- مسلمان اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کرنے کے بجائے طاغوتی قوتوں کے نرغہ میں گھر جائیں اور اس نرغہ سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس وقت بجائے اس کے کہ وہ اس غیر اسلامی زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں- ان پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اپنا سر خدا کے سوائے کسی اور کے سامنے جھکانے پر مجبور نہ کئے جائیں جہاں قانون صرف خدا کا ہو انسانوں کا نہ ہو- فرمایا-

۲۹/۵۶
يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ○ (العنکبوت)

اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو- میری زمین تو بڑی وسیع ہے- پس (وہاں رہو کہ جہاں) صرف میری ہی محکومیت ہو (کسی انسان کی حکومت نہ ہو)

یہی وہ اصول حقہ تھا جس کے ماتحت جناب نبی اکرم صلعم نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ادھر ادھر کے تمام منتشر مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے پہلے اس ایک نقطہ پر حکومتِ خداوندی کی بنیاد رکھی یہیں بیٹھ کر مسلمانوں نے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کیا اور اس کے بعد اللہ کی نصرت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے اس زور وقوت کے ساتھ پھیلے کہ روئے زمین کا گوشہ گوشہ ان کے قدموں کے نیچے آگیا- ان مسلمانوں کی پہلی اور دوسری زندگی کا موازنہ فرماتے ہوئے ان سے کہا گیا- کہ

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (8/26)

ذرا اس وقت کو یاد کرو کہ تم اقلیت میں تھے- ملک میں ناتواں اور کمزور شمار کئے جاتے تھے (ہر وقت) اس خطرہ میں رہتے تھے کہ دشمن تمہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لیجائیں- پس اس حالت میں اللہ نے تمہاری حفاظت کی اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت دی اور تمہیں رزقِ طیب عطا فرمایا- تاکہ سپاس گزار بنو اور یہ حفاظت و نصرت اس شکل میں آئی تھی کہ مسلمانوں نے ایک خاص خطۂ ارض میں جمع ہو کر اپنی قوتوں کو مرکوز کیا اور وہاں سے پھر قوت و شوکت کے ساتھ چاروں طرف بڑھے- مسلمانوں کی منتشر قوتوں کا ایک خاص گوشہ میں جمع ہونے کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ اس وقت منافقین کے دعویٰ اسلام کے اثبات کی دلیل ہی یہ قرار دی گئی تھی کہ یہ مسلمانوں کے اس مرکز کی طرف آتے ہیں یا نہیں- چنانچہ مسلمانوں سے کہا گیا کہ دیکھنا! وہ منافق جو اسلام کی شوکت و عظمت کے حصول کی خاطر تمہارے اس طریق پر عمل پیرا نہیں ہو رہے- وہ تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہیں-

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ (۴/۸۹)

انہیں بالکل اپنا دوست نہ بناؤ تاوقتیکہ اللہ کے راستہ میں ہجرت نہ کریں-

☆

چند آیات کے بعد ارشاد ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ایسے وقت میں مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسلامی مرکز کے

بجائے غیر اسلامی علاقوں میں زندگی بسر کرنے پر قانع ہو گئے اور باز پرس کے وقت یہ عذر پیش کر دیا۔ کہ
كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ط (ہم کمزور اور ناتواں تھے) "اگر غیر مسلموں کی محکومیت میں زندگی بسر نہ کرتے تو کیا کرتے! ہم میں قوت کہاں تھی کہ اپنی حکومت قائم کر سکتے تو ان سے کہا جائے گا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ط فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (4/97) کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی۔ کہ تم اس میں ہجرت کر کے اس مقام کی طرف چلے جاتے جہاں اللہ کی حکومت تھی) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت بری جگہ ہے رہنے کی۔

حیاتِ اُخروی کا جہنم تو بعد میں آئے گا۔ اس دنیا میں غیر اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کرنا اگر جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔

اور منافقین تو ایک طرف وہ مسلمان جنہوں نے ضعفِ ایمان کی بنا پر ہجرت کرنے میں تأمل کیا۔ ان کے متعلق دوسرے مسلمانوں کو فرمایا۔ کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ط (8/72)

اور وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر انہوں نے ہجرت نہ کی۔ (اے مسلمانو) تمہاری دوستی اور پشت پناہی میں ان کا کوئی حصہ نہیں تاوقتیکہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ساتھ نہ آملیں اور قرآن کریم کی رو سے مومن حقا۔ سچے مومن کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا ------ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (8/74)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور مدد کی ان کو بخشش ہے اور روزی عزت کی۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے کسی گوشۂ ارض میں حکومت الٰہیہ کے قیام و بقا کے لئے اگر گھربار سب کچھ چھوڑ کر ہجرت بھی کرنا پڑے تو یہ چیز عین فریضۂ خداوندی اور جزوِ ایمان بلکہ شرطِ ایمان ہو جاتی ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ ابھی ہجرت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ صرف اپنے اس علاقہ میں جہاں مسلمان اکثریت میں بستے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام کی تجویز ہے اور ہمارے یہ جدید "مفسرین کرام" اور "مجددینِ ملت" ہیں کہ اس کو بھی اسلام کے منافی اور قرآن کے خلاف بتا رہے ہیں محض اس لئے کہ ہندو اس اسکیم کو پسند نہیں کرتے۔

دوسرا اعتراض جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مسلمان اس طرح ایک گوشۂ ارض میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو اسلام کی اشاعت رُک جائیگی اور یوں یہ اہم فریضۂ خداوندی ساقط ہو جائے گا۔ ان معترضین کے نظریہ کے مطابق گویا صورت یوں قائم ہو گی کہ جب مسلمان شمال مغربی حصۂ ملک میں الگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو پھر ان کے چاروں طرف بڑی بڑی خندقیں کھود کر انہیں آگ سے بھر دیا جائے گا اور یہ حکم دیدیا جائے گا کہ جو شخص اس دائرہ آتشیں سے باہر جانے کی کوشش کرے گا۔ داخل جہنم کر دیا جائے گا! ہم اس اعتراض کے طفلانہ پن کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ اگر یہ کھلی ہوئی فریب دہی نہیں تو چھپی ہوئی خود فریبی ضرور ہے۔ انگریز دنیا کے ایک کونے میں۔ ایک چپہ بھر جزیرہ کو اپنا مرکز بنائے، ساری دنیا میں تہذیب و معاشرت کی "تبلیغ" کر رہا ہے اور اس کی یہ "تبلیغ" قلوب و اذہان پر اس درجہ مسلط ہو رہی ہے کہ لوگوں کے نہ کان اپنے رہے ہیں نہ آنکھیں، نہ دل اپنے رہے، نہ دماغ، وہ سنتے ہیں تو ان کے کانوں سے، دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے، سوچتے ہیں تو ان کے دل سے، سمجھتے ہیں تو ان کے دماغ سے، یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے! صرف

اس عظمت و جلال کے زور پر جو اس قوم نے حاصل کر رکھا ہے اور یہ صرف انہی علاقوں میں نہیں جہاں انگریز کی حکومت ہے۔ بلکہ جو علاقے خود مختار ہیں۔ وہاں بھی یہ حالت ہے کہ لوگ فرنگی تمدن کو از خود مستعار لئے جا رہے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ اس تمدن کی حامل قوم کی برتری اور فوقیت کا تصور لوگوں کے دلوں میں غیر محسوس طور پر جاگزین ہو چکا ہے۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ اگر مسلمان ایک گوشۂ ارض میں بیٹھ کر شوکت و عظمت کی زندگی حاصل کر لیں تو کہئے اس کے بعد وہ کونسی "سدِّ سکندری" ہو گی جو اُن سے عبور نہ کی جائے گی۔ وہ کونسی خندقیں ہوں گے جو ان کے راستہ میں حائل ہوں گی کہ وہ باہر جا کر اشاعتِ اسلام نہ کر سکیں گے۔ ذرا اشاعتِ اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ دنیا کے اس قدر دُور دراز گوشوں میں شمعِ خداوندی کی نورانی کرنیں پہنچیں کس طرح! ذرا سے غور کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جب مسلمانوں کا ایک مرکز مضبوط ہوا تو اس سرچشمہ سے مختلف سوتیں پھوٹیں اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں جوئے رواں بن کر پھیل گئیں۔ زندہ اور آزاد قوم کا کوئی فرد جہاں جائے گا، عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور اگر وہ ایسے تمدن کا حامل ہو جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہ مل سکے اور خود اس تمدن کا ایک پیکرِ تمثیلی بھی ہو۔ تو پھر تو پوچھئے نہیں کہ وہ کس قدر گہرا اثر دلوں پر چھوڑ جاتا ہے۔ اسلام کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ اس قسم کے زندہ اور آزاد افراد تھے علیہ الرحمتہ خود آزاد ہوئے سرفراز ہوئے اور اس کے بعد دنیا میں جہاں گئے دنیا نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور جو ان کے حلقہ اثر میں آگیا، پھر نکل کر نہ جا سکا۔ لیکن جس کے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہ ہو جو خود ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ دنیا کے سامنے کیسا ہی شاندار پیغام کیوں نہ پیش کرے۔ دنیا حقارت کی ہنسی سے اس کا استقبال کریگی۔ آپ اتنے عرصہ سے انگلستان اور جرمنی میں اسلامی مبلغ بھیج رہے ہیں۔ وہاں مساجد تعمیر ہو رہی ہیں۔ تبلیغی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں! کہئے کہ اس کا کوئی جاذب نگاہ نتیجہ بھی سامنے آیا! یہ کیوں! کیا (نعوذ باللہ) آپ کا پیغام۔ فرنگی تمدن و معاشرت کے مقابلہ میں کمزور اور ناقص تھا؟ یہ وجہ تو نہ تھی! وجہ یہی تھی کہ غلام جہاں جائے گا، نفرت و حقارت سے دیکھا جائے گا۔ اس سے سب سے پہلا سوال یہی کیا جائے گا کہ اگر تیرے پاس یہ آبِ حیات موجود ہے تو خود اپنے اندر زندگی کی رمق پیدا کیوں نہیں کرتا! اگر یہ نسخۂ کیمیا تیرے قبضہ میں ہے تو دوسروں کے دروازہ پر گداگری کے لئے جھولی کیوں پھیلاتا ہے! دنیا میں اگر اسلام آج اس عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس کا یہ مستحق ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اسلام کو پیش کرنے والے ہم ہیں جو غلامی کے ٹکڑوں پر گذارہ کر رہے ہیں۔ آپ غیر مسلموں میں اسلام کا ذکر فرماتے ہیں اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اگر چندے اور یہی حالت رہی تو نہ معلوم بھوک اور افلاس سے تنگ آکر کتنے مسلمان دوسروں کے آغوش میں چلے جائیں گے اور آپ کو کیا معلوم کہ پست درجہ کے افلاس زدہ قبائل میں یہ عملی ارتداد کس سرعت لیکن خاموشی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ موجودہ صورتِ تشتت و انتشار میں جسے آپ اسلامی زندگی بتا رہے ہیں، مسلمانوں میں وہ کونسی جذب و کشش باقی ہے۔ جس کی وجہ سے غیر مسلم کھنچ کر ان کی طرف آجائیں۔ ہندوستان کے کروڑہا اچھوت، ہندو اتم جاتی کے پنجۂ استبداد سے تنگ آکر بار بار اس امر کا ارادہ کر چکے ہیں کہ وہ کوئی ایسا مذہب اختیار کر لیں جو ان سے اخوت و مساوات کا سلوک کرے اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام کے سوا کونسا مذہب ہے، جو ان کے ان داعیات کو پورا کر سکتا ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے سوا کہیں اور جائے پناہ نہیں ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خود بھوکوں مر رہے ہیں۔ غربت و افلاس سے ان پر زمین تنگ ہو رہی ہے۔ تو وہ پھر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اگر آپ کی قوم میں شوکت و سطوت۔ عظمت و حکومت ہوتی تو پھر دیکھتے کہ **يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا** کا سماں کیسے جنت نگاہ بنتا۔ اگر آج ملک کے ایک حصہ میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ جورو استبداد کے

ستائے ہوئے۔ یہ ہر دروازے سے دھتکارے ہوئے حقوق انسانیت سے محروم رکھے ہوئے انسان کس طرح پروانہ وار شمع اسلام کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اگر جرأتِ عرض معاف کی جائے تو ہم اس مقام پر ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ سر سکندر حیات خاں صاحب فرماتے ہیں کہ موجودہ شکل میں اسلام کی اشاعت زیادہ ہو سکتی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب خیر سے حکومتِ پنجاب کے بلند ترین منصب پر فائز المرام ہیں۔ انہیں مذہبی آزادی بھی حاصل ہے۔ دولت بھی ان کے پاس ہے اور قوت بھی۔ ذرائع بھی بہت وسیع ہیں اور وسائل بھی۔ ان تمام امور کے باوجود وہ ذرا ارشاد تو فرمائیں کہ انہوں نے آج تک کتنے ہندوؤں کو مسلمان کیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ گہری تفکر طلب باتیں ہیں۔ جب ایک "اسلامی صوبہ" کے وزیراعظم کی یہ حالت ہو تو یہ کہنا کہ موجودہ حالت میں اسلام کی اشاعت زیادہ زور سے ہو رہی ہے حقائق سے چشم پوشی نہیں تو اور کیا ہے! پھر یہ چیز بجائے خود غور طلب ہے کہ جس اسلام کو آپ آج اسلام کہہ رہے ہیں وہ اسلام کی نگاہ میں اسلام ہے بھی! کیا دنیا میں محکوم کا بھی کوئی مذہب ہوا کرتا ہے؟ اور کیا اسلام ایسے ہی مسلمان پیدا کرنا چاہتا ہے جو خود بھی غلام ہوں اور جو ان کی طرف آئے اسے بھی اپنے جیسا غلام بنا لیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے' یقین مانئے کہ آزاد مسلمان تو اگر نو بھی ہوں تو نو کروڑ غلاموں کے مقابلہ میں اسلام کے لئے زیادہ گراں قدر متاع ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس بات کو آج کل سمجھایا کیسے جائے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

اور پھر آپ نے اس چیز کو بھی سوچ لیا ہے کہ ہندوؤں کے منصوبے کیا ہیں! ڈاکٹر مونجے نے ابھی اگلے دنوں اعلان کیا ہے کہ ہندو مسلم مناقشات کے حل کا راز اس میں ہے کہ مذاہب کی تبدیلی قانوناً" ناجائز قرار دیدی جائے۔ یہ تو ہیں بے نقاب ہندو۔ لیکن اس کے ساتھ اگر انہیں بھی دیکھ لیا جائے۔ جو "مہاتمائیت" کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں تو ان کے ارادے اور بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ واردھا کی تعلیمی اسکیم۔ جو ایک مسلمان کے ہاتھ سے مرتب کرائی گئی ہے اور یہ جدید تفسیرِ قرآن جو مولانا آزاد کے "برھو سماجی اسلام کی بنیاد ہے۔ اگر اشاعت اسلام کو روکنے کی تدابیر نہیں تو اور کیا ہیں! یہ تعلیم کہ "عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی اور مذہب پر کوئی فوقیت اور برتری حاصل نہیں"۔ اسلام میں کونسی جذب و کشش باقی رکھ سکتی ہے جو آپ غیر مسلموں کو اسلام کے حلقۂ آغوش میں لے آئیں گے اور پھر آپ کے نوجوانوں کے دلوں میں اس تعلیم کا راسخ کر دینا کہ نظامِ زندگی اخلاق کی بنیادوں پر نہیں بلکہ اقتصادیات کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔ ان کے اندر مذہب کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تمام تحریکیں اسی منظم پروگرام کے ماتحت بروئے کار لائی جا رہی ہیں کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ اس سے باغی ہو کر آئیں اور یہ اس وقت ہو رہا ہے جب ابھی زمامِ اقتدار پورے طور پر ہندو کے ہاتھ میں نہیں آئی۔ جب تمام و کمال اختیارات ہندو اکثریت کے ہاتھ میں آجائیں گے۔ اس وقت دیکھئے گا کہ آپ کو اشاعتِ اسلام کے کس قدر مواقع دئے جاتے ہیں۔

پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر ایک خطۂ زمین میں اسلامی حکومت ابتداء" اشاعت اسلام کے منافی ہوتی تو جب نبی اکرمؐ نے منتشر مسلمانوں کی قوتوں کو مدینہ منورہ میں مرکوز کیا ہے اور دوسرے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا گیا کہ وہ ہجرت کر کے وہیں آجائیں۔ تو اسوقت وہ مسلمان بھی یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر ہم سب ایک مقام پر سمٹ کر جمع ہو گئے تو اشاعتِ اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے یہ اعتراض بالکل نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک طاقتور مرکز کے بغیر صحیح

اسلام کی اشاعت کا تصور سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ جب مرکز مضبوط ہو گیا تو پھر وہاں سے مبلغ بھی نکلے۔ دعاۃ بھی مختلف مقامات میں پھیلے۔ سفیر بھی مختلف سلطنتوں میں پہنچے اور پھر ان مختلف چشموں سے کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہو گیا۔ یہ ہے اشاعت اسلام کی صحیح صورت۔

اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ سردست۔ مسلمانوں کا سمٹ کر ایک گوشہ میں مرکوز ہو جانے کا تو سوال ہی کہیں نہیں۔ ابھی تو صرف اتنی تجویز ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ان علاقوں میں اکثریت کی حکومت قائم کر لی جائے۔ اس میں سمٹنے اور گوشوں میں محصور ہو جانے کا سوال کہاں سے آگیا۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ اس قدر فہم و بصیرت کے مدعی بنتے ہیں اور باتیں ایسی طفلانہ کرتے ہیں۔

☆

تیسرا اعتراض پھر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس اسکیم کی رو سے ہندوستان کے ان مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں رہتے ہیں۔ کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے! غور فرمایئے کہ یہ اعتراض ہندو دماغوں کی کتنی زبردست شاطرانہ عیاری کا آئینہ دار ہے۔

گویا اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ دیکھو! یہ مسلم لیگ۔ جس کی کامیابی اور کامرانی تمہاری قربانیوں کی بدولت ہے۔ اس کی روش یہ ہے کہ تمہیں بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں چھوڑ دیا اور اکثریت کے صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس پروپیگنڈا کا لازمی نتیجہ تھا کہ سادہ لوح مسلمان واقعی اس دامِ فریب میں اُلجھ جاتا۔ لیکن الحمد للہ کہ مسلمان میں اب اتنی بصیرت پیدا ہوتی جا رہی ہے کہ وہ دوست اور دشمن میں تمیز کر سکے۔ ذرا اس اعتراض کا حالات کی روشنی میں تجزیہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی کہیں پانچ ہے، کہیں سات، کہیں دس ہے، کہیں چودہ، ان پر اگر بڑا کرم ہوا تو آبادی کے تناسب سے دو چار نشستیں زیادہ مل گئیں۔ لیکن سوچئے کہ اس سے فرق کیا پڑا۔ حکومت کا انداز جمہوریت ہو گا۔ فیصلے اکثریت کی آرا سے ہوں گے۔ اقلیت دس کی ہوئی تو کیا اور تیس کی ہوئی تو کیا۔ وہ تو اقلیت ہی رہے گی۔ دس بیس تو ایک طرف اقلیت تو 49 کی بھی ہو تو بھی اقلیت ہی رہتی ہے۔ اس لئے دو چار نشستوں کی کمی بیشی سے ان کی حالت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ صورت ہو گی الگ الگ صوبوں میں اور مرکز میں یہ حالت ہو گی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان مل کر کل آبادی کا قریب ایک چوتھائی ہوں گے۔ لہٰذا وہاں بھی یہ اقلیت میں رہیں گے اور وہاں بھی فیصلے ہندو اکثریت کی رائے کے مطابق ہوں گے۔

اب لیگ کی اسکیم کو لیجئے۔ اس کی رُو سے ان صوبوں کا جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ ایک الگ مرکز ہو گا اور ان صوبوں کا جہاں ہندو اکثریت میں ہیں جداگانہ مرکز ہو گا۔ ہندو اکثریت کے مرکز میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے۔ ایسے ہی اقلیت میں جیسے آج ہیں (یا جیسے تمام ہندوستان میں ایک مرکز ہونے کی صورت میں اقلیت میں ہوں گے) لیکن اس کے برعکس مسلمان اکثریت کے صوبوں کے مرکز میں ان کی اکثریت ہو گی اور وہاں کے فیصلے مسلمان اکثریت کی رائے کے تابع ہوں گے۔ لہٰذا صورت حالات یوں ہوئی کہ

(1) ہندو نظام حکومت کی رُو سے

(ا) اقلیت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے۔

(ب) مرکز میں بھی مسلمان اقلیت میں رہیں گے۔

(2) مسلم لیگ کی اسکیم کی رُو سے

(ا) اقلیت والے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے اور

(ب) اپنے مرکز میں یہ اکثریت میں ہوں گے۔

اب خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی اسکیم کے خلاف کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ مسلمان اس اسکیم کی مخالفت کریں تو ان کا یہ طرزِ عمل کس قدر اسلام کی حمایت میں ہو گا! یوں سمجھئے کہ قید خانہ کے کمرے میں دو قیدی ہوں اور ایک ایسی تجویز درپیش ہو کہ جس سے ان میں سے ایک قیدی آزاد ہو سکتا ہو۔ اس وقت اگر دوسرا قیدی یہ کہہ کر اس تجویز کی مخالفت کرے کہ نہ بھائی! میں تو تمہیں آزاد نہیں ہونے دوں گا۔ تم چلے گئے تو میرا جی اُداس ہو جاوے گا۔ میں باتیں کس سے کروں گا۔ اس لئے بھیا۔ میں اس تجویز کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ تو خیال فرمالیجئے کہ آپ اس رفیق کے جذبۂ رفاقت و ہمدردی کی کتنی داد دیں گے! اسے تو چاہئے کہ اس تجویز کی پوری پوری قوت کے ساتھ تائید کرے کہ دو قیدیوں کے مقابلہ میں ایک قیدی اور ایک آزاد تو بہرحال اچھا ہے۔ یہ آزاد باہر نکل کر پھر اپنے دوسرے بھائی کی آزادی کے لئے بھی کوشش کر سکتا ہے! اس لئے اقلیت کے صوبہ کے مسلمانوں نے فی الواقعہ بڑی دانش اطواری و جذبۂ اخوتِ اسلامی کا ثبوت دیا جب انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں اس ریزولیشن کی بلا مشروط تائید کی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ایسی ہی اُمید رکھنی چاہئے۔

یہ تو ہے تصویر کا ایک رخ۔ اب دوسری طرف آیئے۔ اس وقت تمام ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اکثریت کی طرف سے ان پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی مدافعت کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہیں۔ اگر ملک میں دو الگ الگ مراکز ہوں تو جہاں ہندو اکثریت کے مرکز میں مسلم اقلیتیں آباد ہوں گی وہاں مسلمان اکثریت کے مرکز میں ہندو اقلیتیں ہوں گی۔ اس لئے اس وقت ہندو اپنی مسلم اقلیت پر دراز دستی کرتے وقت سو مرتبہ سوچے گا کہ اسے معلوم ہو گا کہ

میرے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے

آج جو کچھ ہندو کر رہا ہے اسے ذرا غور سے دیکھئے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس کا بنیا پن کس قدر کرشمہ زا ہے اِتم جاتی کا ہندو (Cash-Hindu) بڑی تھوڑی تعداد میں ہے۔ اس نے پنج ذاتوں کے اقوام (اچھوت) کو ہندو بنا کر اپنی تعداد 23 کروڑ تک پہنچائی ہے اور اس تعداد کی حیثیت سے تمام حقوق و مراعات حاصل کر رکھے ہیں۔ لیکن ان حقوق و مراعات میں اچھوت بیچارے ایک پائی کے بھی شریک نہیں۔ یعنی اچھوتوں کے صدقہ میں اکثریت حاصل کرتے ہیں اور ان کو اس میں سے حقوق انسانیت بھی نہیں دیتے۔ یہ ہے ان کا "قومی بنیا پن"۔ اب ان کا ملکی "بنیا پن" ملاحظہ ہو۔ یہ تمام ہندوستان کو ایک ملک اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے کر حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کو اقلیت شمار کر کے حکومت پھر اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اگر آج اچھوت اپنے آپ کو الگ قوم شمار کر لیں تو ہندو مٹھی بھر اقلیت رہ جائے اور اگر مسلمان آج اپنی جداگانہ قومیت کا دعویٰ منوا کر اپنی اکثریت کے علاقہ میں اپنی حکومت قائم کر لے تو ہندو کے رام راج کے منصوبے خوابِ پریشاں بن کر رہ جائیں۔ ہندو اپنی پوری قوت اس باب میں صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو مشتعل کر کے اس تجویز کی مخالفت کرا دے تاکہ اپنی خانہ ساز اکثریت کا طلسم نہ ٹوٹنے پائے۔

اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ تم سے تمہارا وطن چھڑایا جائے گا۔ تمہیں ہجرت کر کے مسلم اکثریت کے صوبوں میں جانا پڑے گا اور اس میں بڑی مصیبت کا سامنا ہو گا۔ سو اول تو سرِدست لیگ کی اسکیم میں تبادلۂ

آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جس ترک وطن سے مسلمان کو ڈرایا جاتا ہے۔ سوچئے تو سہی کہ وہ ترک وطن ہے کیا چیز!

باب اول میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک اصولِ فطرت کے مطابق زندگی وہاں بسر ہوتی ہے جہاں نظامِ زندگی قوانین الٰہیہ کے مطابق متعین ہو۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر زندگی غیر فطری ہے۔ اب ایک مثال کے ذریعے یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ ترکِ وطن کیا ہے! کسی جنگل میں ایک گائے رہتی ہو۔ ادھر ادھر سبز سبز گھاس' گھنے درختوں کا سایہ' ماحول سے مانوس' گردوپیش سے مالوف۔ یہ اس کا وطن ہے۔ اس وطن میں وہ خوش ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آگیا کہ وہاں پانی خشک ہو گیا۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ کہیں آس پاس پانی مل جائے۔ لیکن ناکام رہی۔ اب اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ پانی کی تلاش میں نکلے اور جہاں پانی ملے۔ وہیں زندگی بسر کرے۔ یہ ہے اس کا ترکِ وطن جو عین تقاضائے فطرت کے مطابق ہے۔ اب اگر اس "ہجرت" کے وقت گردوپیش کے سنگ ریزے جمع ہو کر اسے سمجھائیں کہ تم یہ کیا کر رہی ہو! ایک عمر یہیں گذاری۔ یہاں کے ذرہ ذرہ سے تمہیں انس تھا۔ اپنا گھر بنا کر بیٹھی تھیں۔ ہم تمہارے ساتھی دل بہلانے کو موجود تھے۔ تم نہ جاؤ۔ کیا تمہیں اپنے گھر سے محبت نہیں؟ اس کے جواب میں جو کچھ وہ گائے کہے گی ظاہر ہے۔ وہ کہے گی کہ بھائی! یہ سب کچھ درست لیکن مشکل یہ ہے کہ تم میرے ادعائے فطرت سے واقف نہیں ہو۔ اب یہاں کی زندگی میرے لئے غیر فطری ہے۔ میری پیاس کا تقاضا ہے کہ میں پانی کے مقام پر پہنچوں۔ یہ ماحول اسی وقت تک میرا وطن تھا جب تک میرے تقاضائے فطرت کو پورا کر رہا تھا۔ میں نے اسے وطن بنایا ہی اس لئے تھا۔ اب اگر یہ سرزمین میری فطرت سے سازگار نہیں رہی اور اسے سازگار بنانا میرے بس میں نہیں۔ تو میرے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں کہ میں اس مقام کو اپنا وطن بنالوں جو میرے تقاضائے فطرت کو پورا کرے کہ **اِنَّ اَرْضَ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ** اب یہاں رہنا میرے لئے خودکشی کے مرادف ہے جو ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس وقت اگر اس ماحول اور ماحول کا انس دامنگیر ہو گیا تو میں نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ اس لئے اب میرا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔ جب یہاں پانی کی افراط ہو گی۔ پھر آجاؤں گی۔ کہ اصل شے یہ کاک کے ذرے' یہ فضا کی ہوا' یہ درختوں کے سائے۔ یہ خوشنما منظر نہیں بلکہ اصل شے پانی ہے کہ اس پر میری زندگی موقوف ہے۔ جہاں وہ ہے۔ وہ صحرا بھی گلشن اور اگر وہ نہیں تو ایسی جنت بھی جہنم۔

☆

اس مثال کو آگے بڑھایئے۔ یہ گھاس اور یہ پانی۔ مقتضیاتِ فطرت ہیں اور ان میں انسان اور حیوان دونو برابر کے شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بنا پر ترکِ وطن صرف اس گائے پر ہی موقوف نہیں۔ انسانوں کے خانہ بدوش قبائل عمر بھر یہی کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں انسان تو حیوانات سے ایک کڑی آگے ہے۔ اس اگلی کڑی (اشرف انسانیت کے لئے بھی) تو کچھ مقتضیاتِ فطرت ہیں۔ یہ مقتضیات وہاں پورے ہو سکتے ہیں جہاں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ جس مقام پر کوئی مسلمان پیدا ہوا ہے۔ وہیں یہ سامان موجود ہیں جو اس کے تقاضائے فطرت کو پورا کرتے ہیں تو وہ خوش قسمت ہے کہ اسے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نہیں جانا پڑا۔ لیکن اگر صورت یہ نہیں ہے تو محض اس لئے اس مقام سے چپکے رہنا کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں۔ میرے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں۔ ایک غیر فطرتی زندگی پر قناعت کر جانا ہے۔ یہ تھا وہ مقام جہاں اسے قرآن کریم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مومن کا وطن وہی ہے جہاں یہ قوانینِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کر سکے اور یہی تھی وہ منزل جہاں اس کے ہادیٔ برحق جناب نبی اکرمؐ کے نقوشِ قدم کا ایک ایک ذرہ اسے

کہہ رہا تھا کہ حضورؐ نے اپنا "وطن" (مکہ) بھی تقاضائے فطرت کے مطابق چھوڑا تھا۔ اب آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ ایک مسلم اور غیر مسلم کے نظریہ وطنیت میں کیا فرق ہے اور ایک مسلمان کا وطن کے ساتھ حقیقی تعلق کیا ہوتا ہے اور کس وقت وطن کی آب و گل کی پابندی اس کے لئے ہلاکت کا موجب بن جاتی ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کے مطابق۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یہ ہے ایک مسلم کا صحیح نظریہ وطنیت۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ غیر مسلم اس فرق کو سمجھ نہیں سکتا۔ جس طرح وہ سنگ ریزے اس گائے کے اقتضائے فطرت کا احساس نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مدت کی غیر فطرتی زندگی سے خود ہماری فطرت بھی مسخ ہو چکی ہے اور جس طرح صفرا کے مریض کو شہد بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے ہمیں یہ ادعائے فطرت (یہ صحیح اسلامی زندگی) کچھ اجنبی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس غیر فطری زندگی کو ہی فطری قرار دیدیں۔ ہماری قوتِ ذائقہ بیشک مسخ ہو چکی ہے۔ لیکن الحمد للہ کہ قرآنی آبگینوں میں وہ عسلِ مصفّٰی اسی طرح موجود ہے کہ **شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ** (وہ قلوب و اذہان کی تمام بیماریوں کا علاج ہے)۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ جس وقت شمال مغربی خطۂ ملک میں اسلامی حکومت کا قیام ہو گا (اور لیگ کی اسکیم اسی کا مقدمہ ہے) اس وقت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے یہ ادعائے فطرت ہو گا کہ وہ اس جہنم کو چھوڑ کر جس میں ہر طرف طاغوتی قوتوں کا پنجۂ استبداد کار فرما ہے۔ اس جنّتِ ارضی میں آجائیں جہاں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو اور پکارنے والا پکار کر کہے کہ

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (۴۳/۷۲) یہ ہے وہ جنّتِ (ارضی) جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہیں۔

☆

چوتھا اعتراض پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے اندازِ حکومت میں مرکز میں بہت کم اختیارات رہ جائیں گے۔ مختلف صوبے اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گے۔ لہٰذا جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں وہاں ہر طرح کا کامل اختیار و اقتدار ہو گا۔ پھر ایک نئے مرکز کی ضرورت کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے مرکز میں بہت کم شعبے ہوں گے۔ لیکن ذرا اس پر بھی غور فرمایئے کہ کیفیت کے اعتبار سے وہ شعبے کیسے ہوں گے۔ مثلاً دفاع (Defence) یعنی شعبۂ فوج مرکز کے زیرِ اختیار ہو گا۔ امورِ خارجہ (بیرونی سلطنتوں سے تعلقات مرکز سے متعلق ہونگے۔ فنانس (مالیات) کی سب سے بڑی مد کسٹم (بحری چونگی) مرکز سے وابستہ ہو گی۔ سلسلۂ رسل و رسائل اور ذرائع آمدورفت پر نگرانی مرکز کی ہوگی۔ خیال فرمایا آپ نے کہ اقتدارِ مرکز کی عمارت کیسے کیسے محکم ستونوں پر قائم ہو گی۔ یوں سمجھئے کہ کسی سے کہدیا جائے کہ تمہیں اپنے کان پر پورا اختیار ہے۔ ناک تمہارے قبضہ میں ہے۔ آنکھ کے معاملہ میں تم آزاد ہو۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کھلے ہیں۔ ان سب معاملات میں تمہیں پوری آزادی ہے۔ البتہ تمہارے دل، دماغ اور معدہ پر ہمارا قبضہ ہو گا۔ ان سے جس طرح ہم چاہیں گے کام لیں گے۔ تو فرمائے کہ یہ آزادی کس قسم

کی ہو گی پھر ہمارے "علماء حضرات" کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ نہیں! ہم جدید نظامِ حکومت میں ایک ایسا شعبہ الگ قائم کرائیں گے جو تمدنی اور معاشرتی مسائل میں احکام نافذ کرے گا اور اس میں کسی غیر مسلم کو دخل نہ ہو گا۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کو کیسے سمجھایا جائے کہ تمدن و معاشرت ہمیشہ حکومت کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں اور حکومت اسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں محکمۂ فوج' محکمۂ امور خارجہ اور محکمۂ مالیات ہوں۔ آج بھی مسلمانوں کے مقدمے "قانونِ محمدی" (Muhammadan Law) کے ماتحت فیصل ہوتے ہیں۔ انگریز نے کبھی اپنا تمدن و معاشرت مسلمانوں پر بزور مسلط نہیں کیا۔ لیکن ان تمام "آزادیوں" کے باوجود آپ کے مذہب' تمدن' معاشرت کی جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ مشکل اندر مشکل یہ کہ ہمارے مولوی صاحبان کے نزدیک مذہب' عبادات و مناسک اور چند رسوم و مظاہر کا نام ہے۔ آج اگر ان سے پوچھا جائے کہ جس چیز کو آپ انگریز کی غلامی کہتے ہیں وہ ہے کیا! کونسی بات ہے جس میں انگریز نے آپ کو غلام بنا رکھا ہے! تو اس کے جواب میں وہ ہندوؤں سے سنی سنائی صرف اتنی بات کہہ سکیں گے کہ انگریز اس ملک کی دولت کو لوٹ کر لے جا رہا ہے۔ ہندوستان کے باشندے فاقوں مر رہے ہیں۔ یہاں کسی کو کپڑا نصیب نہیں ہوتا! چنانچہ یہ حضرات اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں اسی غلامی کا رونا روتے ہیں اور اپنے مسلک کی تائید میں ہمیشہ یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ جب انگریز یہاں سے نکل جائے گا تو پھر ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی ہو جائے گی۔ یعنی ان کے نزدیک غلامی کے معنی بھوک اور افلاس کے ہیں اور آزادی سے مقاصد روٹی کی فراغت ہے ورنہ "مذہب" نہ آج غلام ہے نہ اس کے بعد ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں غلام رہے گا۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اگر ان حضرات کو معلوم ہوتا کہ "اسلام کی آزادی" کے کیا معنی ہیں تو وہ خود سمجھ جاتے کہ جس نظامِ حکومت میں دفاع (محکمہ فوج) اور امورِ خارجیہ جیسے اہم شعبے غیر مسلموں کے اختیار و اقتدار میں ہوں اور ایسے قوانین جن کا اطلاق ملک کے تمام باشندوں پر مشترکہ طور پر ہونا ہو ان کی توضیع و تنفیذ بھی غیر مسلم کی اکثریت پر مبنی ہو۔ اس نظامِ حکومت میں اسلام کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اسلام۔ **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** کا حکم دیتا ہے۔ (کہ حکومت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی' وہ **لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا** ط کا ارشاد نازل فرماتا ہے (کہ اللہ اپنے اس حق حکومت میں کسی اور کی شرکت جائز قرار نہیں دیتا) اس لئے وہی حکومت۔ حکومتِ خداوندی کہلا سکتی ہے جس کے کسی شعبہ میں (چہ جائیکہ ایسے اہم شعبوں میں) غیر مسلموں کی شرکت نہ ہو کہ۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری

☆

پانچواں اعتراض ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہماری ہزارہا مساجد ہیں۔ علیحدگی کی اسکیم کے مطابق یہ تمام معابد چھوڑنے پڑیں گے۔ یہ اعتراض بھی اسی مفروضہ کے ماتحت کیا جاتا ہے کہ اس علیحدگی کی اسکیم کی رُو سے تمام ہندوستان کے کسی اور حصہ میں کوئی مسلمان نہیں رہے گا۔ حالانکہ جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ اسکیم زیرِ نظر میں تبادلۂ آبادی کی کوئی شرط نہیں۔ سردست جو جہاں ہے وہیں رہے گا اور اسی طرح مسلم اکثریت کے علاقوں میں اسلامی

حکومت کے قیام کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن اگر علیحدگی کی اسکیم کی انتہائی شکل کو بھی سامنے رکھ لیا جائے جس میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمان بطیبِ خاطر اسلامی حکومت کی زندگی بسر کرنے کے لئے مسلم اکثریت کے صوبوں میں آنا چاہیں تو اس وقت بھی یہ اعتراض کوئی وقعت نہ رکھے گا۔ نبی اکرم صلعم نے جب ہجرت فرمائی ہے تو کعبہ جیسے مقدّس معبد کو کفار کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر حضور کی نگاہِ آرزو رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھی (**قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ**) لیکن یہ چھوڑ آنا دراصل حاصل کرنے کا مقدمہ اور یہ دور چلے آنا فی الحقیقت قریب آجانے کی تمہید تھا۔ گئے اس لئے تھے کہ پھر آئیں اور آئیں تو اس انداز سے کہ دس ہزار قدوسیوں کی جماعت جلو میں ہو اور فتح و ظفر آگے بڑھ بڑھ کر قدم چوم رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معترض حضرات اس اصل کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ جب کوئی قوم صاحبِ حکومت ہوتی ہے تو اس کی ہر شے ہر مقام پر محفوظ ہوتی ہے۔ عیسائی مشنریوں کو دیکھئے۔ دنیا کے ان دُور دراز مقامات میں جہاں ملک غیروں کا ہو۔ حکومت دُوسروں کی ہو۔ یہ لوگ تنہا جاتے ہیں اور اپنے گرجے تعمیر کرتے ہیں۔ چونکہ صاحبِ حکومت و اقتدار قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں جو ان کے معابد کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اس کے برعکس ایک آپ ہیں کہ نو کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہیں۔ لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کی مساجد دوسروں کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں اور آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ مساجد موجود ہیں لیکن ان میں اذان اور نماز کی اجازت نہیں ملتی۔ اور آپ ہیں کہ نہایت خاموشی سے سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپکی قوتوں کا ہر ایک کو اندازہ ہے۔ حکومت اپنی ہو تو دیکھئے کہ کونوں اور گوشوں میں پڑی ہوئی مساجد کی بھی حفاظت کس طرح ہو جاتی ہے۔ مساجد کو وقار تو باندازۂ وقارِ اہلِ مساجد ہے۔

☆

چھٹا اعتراض پھر کہا جاتا ہے کہ اقتصادیات کے نقطۂ نظر سے یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے۔ بلوچستان اور سندھ اپنا خرچ آپ پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہیں مرکزی حکومت سے امداد ملتی ہے۔ اگر یہ خطہ الگ ہو گیا تو انہیں امداد کہاں سے ملے گی۔ پنجاب میں استطاعت کہاں ہو گی جو ان کی کفالت بھی کر سکے۔ نیز سرحد کی حفاظت کے سلسلہ میں جو اخراجات آج مرکزی حکومت برداشت کر رہی ہے وہ بھی اسی خطہ کو اٹھانے پڑیں گے۔

یہ اعتراض اس مفروضہ پر کیا جاتا ہے کہ حکومت کی مشینری جس قدر (Costly) گراں آج ہے اس وقت بھی ایسی ہو گی۔ لیکن یہ حضرات اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنی اور غیروں کی حکومت میں اتنا ہی تو فرق ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہو گی کہ یہ بڑے بڑے "سفید ہاتھی" اس وقت بھی علیٰ حالہٖ باندھ رکھے جائیں۔ یہ آٹھ۔ دس ہزار روپیہ ماہوار کے گورنر یہ تین چار ہزار روپیہ ماہوار کے وزیراعظم۔ یہ وزراء۔ یہ چیف سیکریٹریز۔ یہ اسپیکرز۔ یہ ممبرز۔ یہ سب کچھ موجودہ نظامِ حکومت کے کرشمے ہیں۔ جب حکومت اپنی ہو تو پھر ان اخراجات کی کیا ضرورت ہو گی؟ جب کانگریس نے صوبوں کی حکومتیں سنبھالی ہیں تو گاندھی جی نے انہیں نصیحت کی تھی کہ دیکھو تمہارے سامنے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے کس طرح شہنشاہی میں بھی اندازِ فقیری کو قائم رکھا تھا۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ کانگریسی وزراء نے کس حد تک اس نصیحت پر عمل کیا لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے اسوۂ حکومت کے اندر غیر مسلم اپنے لئے سامانِ موعظت دیکھتے ہیں تو خود مسلمان اس اسوہ کی روشنی میں کیوں نہ چلیں اور اگر مسلمان اس انداز حکومت کو اپنے لئے بطور نشانِ راہ قرار دے لیں تو پھر وہ کونسی اقتصادی مشکل ہے جو حل نہ ہو سکے گی؟ یہ مشکلات جو آج مسلمان کو اس درجہ

پریشان و متوحش کر رہی ہیں۔ بظاہر اقتصادی مشکلات ہیں۔ لیکن بغور دیکھئے تو ان مصائب کا حقیقی سبب کچھ اور ہے۔ یہ چیزیں تو علامات مرض ہیں۔ علّتِ مرض نہیں ہیں۔ جب علّتِ مرض کا علاج ہو جائے گا تو علامات مرض خود بخود غائب ہو جائیں گی۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

غیر مسلموں کے اعتراضات

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

سابقہ صفحات میں ہم نے جن چند موٹے موٹے اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔ وہ بالعموم مسلمانوں کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ------ کوئی اور بولتا ہے یہ میری زبان نہ سمجھو۔ لیکن کچھ اعتراضات ایسے بھی ہیں جو ہندوؤں کی طرف سے خود ان کی زبان سے عائد کئے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان اعتراضات کا بھی تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔

پہلا اعتراض اس باب میں سب سے پہلے مسٹر راجہ گوپال اچاریہ آگے بڑھے اور انہوں نے مختلف مقامات پر آہ و زاری کی کہ دیکھنا! یہ مسلمان کیا حرکت کر رہے ہیں؟ یہ تو بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ اس اعتراض کی ابتدا گوپال اچاریہ صاحب کی طرف سے ہوئی اور پھر اس کی صدائے بازگشت ملک کے مختلف حصوں سے سنائی دی۔ چنانچہ اب ہر طرف سے یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ مسلمان بھارت ماتا کے حصے بخرے کر رہے ہیں اور اس چیر پھاڑ کا ماتم کچھ ایسے درد انگیز پیرایہ میں کیا جاتا ہے گویا بھارت ماتا سچ مچ کا ایک انسانی پتلا ہے کہ مسلمانوں کی سبعیت و بہیمیت جس کی قطع و برید کر دینا چاہتی ہے اور "خون ریزی" کا یہ منظر اس ماتا کے سپوتوں کو لہو رُلا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ "بھارت ماتا" ہے کیا چیز! یہ ظاہر ہے کہ انگریزوں نے یہاں پہنچ کر کچھ علاقہ فتح کیا (یونہی کہئے کہ فتح کیا اور کیا کہا جائے) اور اس مفتوحہ علاقہ کی حدود بندی کر کے اسے ایک ملک قرار دے دیا۔ اس ملک کا نام "بھارت ماتا" ہے۔ یعنی یہ ایک اتفاقی امر تھا۔ (یا انگریز کی مصلحت کوشی) کہ انگریز درّۂ خیبر تک کا علاقہ فتح کر سکے۔ اس لئے بھارت ماتا وہاں تک پھیل گئی اگر وہ دس میل اِدھر رہ جاتے تو ماتا جی بھی سکڑ جاتیں اور وہ اگر دس میل اور آگے بڑھ جاتے تو یہ بھی ساتھ ہی پھیل جاتیں۔ یعنی بھارت ماتا کا قد و قامت جسم اور جثہ اُس حدود اربعہ کا نام ہے جہاں تک انگریز بڑھا ہے۔ اب فرمایئے جس بھارت ماتا کا وجود اس انداز سے عمل میں آیا ہو اس کے متعلق یہ دہائی مچانا کہ اس میں کمی بیشی کرنا بڑی "ہتیا چاری" ہے کس قدر ابلہ فریبی ہے۔ نیپال کو دیکھئے۔ ایک چھنگلی جتنا علاقہ ہے۔ چونکہ انگریزوں نے اسے فتح نہیں کیا۔ اس لئے وہ بھارت ماتا نہیں بن سکا۔ حالانکہ ہر وقت بھارت ماتا کے سینے پر لٹک رہا ہے۔ سیلون کو انگریزوں نے اپنی انتظامی مصلحتوں کی بنا پر الگ رکھا اس لئے بھارت ماتا بیچاری بغیر پاؤں کے ہی رہ گئی۔ کل تک برما بھارت ماتا کا جزو تھا۔ اسے الگ کر دیا گیا تو بھارت ماتا کا ایک بازو کٹ جانے پر بھی کچھ نہ بگڑا۔ کبھی آپ نے سوچا بھی کہ ہندوؤں نے برما کی علیٰحدگی پر کیوں اتنا واویلا نہیں مچایا۔ جتنا شمال مغربی علاقہ کی علیٰحدگی پر مچایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ برما میں

ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ الگ ہونے پر بھی وہاں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ برعکس اس کے شمال مغربی علاقہ کی علیٰحدگی پر اس لئے سینہ کوبی ہو رہی ہے کہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور ہندو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ مسلمان کسی خطۂ ملک میں اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ ہندو تو اس بنا پر بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو جانے پر مصروفِ آہ و بکا ہے۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان قومیت پرست مسلمانوں سے جو اس شین و شیون میں ہندوؤں کے ہم نوا ہیں کہ ان تقسیم سے آپ کے دل میں کیا درد اُٹھا ہے؟ محض اس لئے کہ آپ نے بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اپنے ملک کو مادرِ وطن کہنا شروع کر دیا ہے! ذرا سوچئے تو سہی کہ اسلام کے دعویٰ کے ساتھ یہ مادرِ وطن کا نظریہ کیا معنی رکھتا ہے؟ قرآن تو حقیقی ماں باپ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے کہ اگر وہ تمہارے خدا کے راستہ میں حائل ہو جائیں اور اس وقت ان کی کشش و محبت تمہارے دل کو ان کی طرف جھکا دے تو تم مسلمان کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہو اور ایک آپ ہیں کہ خاک کے ذروں کو اپنی مادر بتاتے ہو اور پھر اس مادر کی محبت اس قدر تمہارے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ اسے جزوِ ایمان قرار دے لیتے ہو! اواخر اپریل میں دہلی میں جو "آزاد" کانفرنس منعقد ہوئی ہے اس کے پنڈال میں سٹیج کے سامنے بڑی نمایاں جگہ بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا کہ

"حب الوطن من الایمان"

اور بائیں جانب اتنے ہی بڑے حروف میں تحریر تھا کہ "حیا اور وطن کی محبت ایمان کی نشانیاں ہیں"۔ ان "قطعات" کے سایہ میں بڑے بڑے جید علمائے کرام کانفرنس منعقد فرما رہے تھے! کیا کوئی صاحب ان میں سے کسی سے پوچھ کر ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آخر ——— "حب الوطن من الایمان" یہ ہے کیا؟ خدا نکردہ کوئی آیتِ قرآنی ہے کوئی حدیثِ رسول اللہ ہے۔ خلافتِ راشدہ کا موٹو ہے۔ یہ کیا چیز ہے جسے اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ کلام اللہ کو چھوڑ کر اقوالِ رسول اللہ کو (نعوذ باللہ) پسِ پشت ڈال کر اسے سب سے نمایاں جگہ آویزاں کیا جا رہا ہے اور پھر "حیا اور وطن کی محبت ایمان کی نشانیاں ہیں"۔ لکھ کر جس سادگی و مکاری سے عوام کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش کی گئی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ "حیا ایمان کی شاخوں میں سے ہے"! یہ ایک مشہور حدیث ہے۔ اس کے ساتھ وطن کا ٹکڑا شامل کر کے ان مولوی صاحبان نے جس تدلیس و تحریف کا کھلا ثبوت دیا ہے وہ ان کی مقدس قباؤں اور متبرک عباؤں کے نیچے چھپے ہوئے دل کی حقیقت کو بے نقاب کر رہی ہے۔ ہم ان اجارہ دارانِ دینِ حنیف سے باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ "وطن کی محبت" کو ایمان کی نشانی' اللہ نے قرار دیا ہے یا اللہ کے رسول نے قرار دیا ہے۔ بالآخر یہ کس کا فیصلہ ہے کہ وطن کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔ حیرت ہے کہ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ یہ حضرات اب اس حد تک بے باک ہو گئے ہیں کہ نہ انہیں خدا کا خوف ہے نہ عاقبت کا ڈر۔ دین کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور اس درجہ کھلا ہوا مذاق۔ وطن کی محبت کو ایمان کی نشانی بتاتے ہیں اور پھر اس یکسر غیر اسلامی نظریہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا یہ خدا و رسول کا فرمان ہے!

زمین بر صوفی و ملا سلامے
کہ پیغام خدا گفتند ما را

ہاں تو یہ ہے حقیقت ہندو کی "بھارت ماتا" اور ان کے زلّہ چین مسلمان کی "مادر وطن" کی یعنی اس کا وجود طوقِ غلامی کے اُس حصہ پر مشتمل ہے جو اسے انگریز نے پہنایا اور اب اسے ایسا مقدس بتایا جا رہا ہے کہ اس کے حدود کا تعین گویا خود ایشور پرماتما نے کیا تھا۔ جس میں کوئی انسان ردّو بدل نہیں کر سکتا۔ خود داری اور حمیت کا تو تقاضا یہ ہے کہ ان حدود و قیود کو جس قدر ممکن ہو توڑ کر رکھ دیا جائے کہ یہ حدود دراصل یادگار ہیں انگریز کے عہدِ حکومت کی جسے تم غلامی کا زمانہ کہتے ہو' لیکن جس کی آب و گِل میں خوئے غلامی پیوست ہو چکی ہو وہ غلامی کی یادگار کو مٹائے گا کیوں! اسے مٹائے گا تو مسلمان ہی مٹائے گا جو فطرۃً آزاد ہے اور غلامی جس کے ہاں مسخ شدہ فطرت کی نشانی ہے۔

☆

گاندھی جی کے اعتراضات اب ہم طوطی پسِ آئینہ۔ یعنی ان معترضین کے اُستادِ ازلی' جناب گاندھی جی کے اعتراضات کا تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ وہ کس درجہ وقیع ہیں۔ وہ حسبِ معمول۔ اس میدان میں بھی اپنی شانِ مہاتمائیت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔

چہرہ زرد۔ لب پہ آہ سرد۔ غم سے نڈھال۔ دونوں ہاتھ سے کلیجہ تھامے۔ افتاں خیزاں تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

> "میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات۔ اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے۔ بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز 1940-4-7)

اللہ اکبر! مسلمانوں کا درد مہاتما جی کے قلبِ حزیں کو کس درجہ ستا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غم میں گھُلے جا رہے ہیں کہ اسلام کے دامنِ تقدیس پر کوئی دھبّہ نہ آجائے۔ مسلمانوں کو کوئی سیدھے راستہ سے بھٹکا نہ دے۔ اللہ رے اندازِ غمنوازی! ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو۔

اس اثر و درد میں ڈُوبی ہوئی تمہید کے بعد اعتراضات ملاحظہ فرمایئے۔ گاندھی جی علیٰحدگی کی اسکیم کے خلاف براہِ راست اعتراض نہیں کرتے بلکہ وہ اس اصول کے خلاف اعتراض کرتے ہیں جس پہ علیٰحدگی کی اسکیم مبنی ہے۔ یعنی وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ نظریہ سراسر "غیر اسلامی" اور حقائق کے خلاف ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور چونکہ علیٰحدگی کی اسکیم کی بنیاد ہی اس "مفروضہ" پر ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اس لئے جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ جداگانہ قوم ہی نہیں تو پھر جداگانہ حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں۔

> "دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا ان کے آبا و اجداد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے۔ بنگال کا مسلمان وہی زبان بولتا ہے جو وہاں کا ہندو بولتا ہے۔ وہی کچھ کھاتا ہے۔ انہی چیزوں سے دل بہلاتا ہے جن سے ان کا ہندو ہمسایہ دل بستگی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ ان کا لباس ایک جیسا ہوتا ہے۔ میرے لئے اکثر بیرونی علامات کی بناء پر ایک مسلمان بنگالی اور ہندو بنگالی

میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے------ جب میں نے سر علی امام (مرحوم) کو پہلی دفعہ دیکھا- میں قطعاً" محسوس نہ کر سکا کہ وہ ہندو نہیں ہیں- ان کی گفتگو- لباس- آداب و اطوار- خوراک سب وہی تھے جو ان ہندوؤں کے تھے جن میں وہ رہتے تھے------ جب میں پہلی مرتبہ قائداعظم مسٹر محمد علی جناح سے ملا ہوں تو پہچان ہی نہیں سکا کہ وہ مسلمان ہیں------ ان کی قومیت تو ان کے چہرے اور آداب و اطوار پر لکھی ہوئی تھی- قارئین یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میں کئی دنوں تک نہیں مہینوں تک مسٹر پٹیل (آں جہانی) کو مسلمان ہی سمجھتا رہا کیونکہ وہ ڈاڑھی رکھتے تھے اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے------ پس ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں ہیں- جنہیں خدا نے ایک بنا دیا ہو انسان انہیں کبھی دو نہیں بنا سکتا------ میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ (حیات) کے مذاہب ہیں- کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ میرا یہ قلبی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے اور ہم تمام ایک ہی خدا کے عیال ہیں- خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں- میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں؟- (ہندوستان ٹائمز 4 اپریل 1940ء)

ملاحظہ فرمائیے آپ نے وہ تمام دلائل جن کی بناء پر گاندھی جی کے نزدیک مسلمان ایک الگ قوم نہیں بن سکتے؟ یعنی

(1) ہندوستان کے مسلمان چونکہ نو مسلم ہیں- یا نو مسلموں کی اولاد ہیں- اس لئے تبدیلیٔ مذہب سے قومیت کی تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی-

(2) ہندو اور مسلمان چونکہ ایک زبان بولتے ہیں- ایک جیسا لباس پہنتے ہیں- ایک جیسا کھاتے پیتے ہیں- بظاہر دیکھنے سے ایک دوسرے سے پہچانے نہیں جاتے- اس لئے ایک قوم کے افراد ہیں-

(3) زبان- لباس- خوراک- آداب و اطوار کی یکسانیت کی بناء پر خدا نے انہیں ایک قوم بنا دیا ہے- اس لئے کوئی انسان ان کو الگ الگ قومیں قرار نہیں دے سکتا-

(4) قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے-

(5) ہندو مت اور اسلام ایک ہی کلچر اور ایک ہی نظریۂ زندگی پیش کرتے ہیں-

اگر آپ کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ دلائل کس کی طرف سے دیئے گئے ہیں تو آپ ان کے طفلانہ پن پر اپنی ہنسی نہ تھام سکیں- لیکن چونکہ یہ دلائل اس کی طرف سے ہیں جسے ایک قوم دنیا کا سب سے بڑا انسان مانتی ہے اس لئے مجبوراً انہیں درخورِ اعتنا سمجھنا پڑتا ہے- گاندھی جی نے اکثر اس دعویٰ کا اعادہ کیا ہے کہ انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے- قرآن بھی پڑھا ہے اور سیرتِ مقدسہ پر بھی عبور ہے- اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو حیرت ہے کہ وہ کونسا قرآن اور کونسی سیرت کی کتاب تھی جس کے مطالعہ نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا جس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد یہ دلائل انہوں نے اس شرح و بسط سے پیش فرمائے ہیں- ہم گاندھی جی کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ سب باتوں سے قطع نظر صرف اسلام کے اوّلین دور کی تاریخ کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ وہ انہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے- اس حقیقت سے تو کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نبیٔ اکرم صلعم نے اسلام کے ذریعہ سے ایک جدید قوم تیار فرمائی تھی جسے ملّتِ اسلامیہ کہا جاتا تھا- وہ قوم جسے قرآنِ کریم نے کہیں خیر

امۃً کہا۔ کہیں امت وسطٰی قرار دیا۔ کہیں انہیں حزب اللہ (اللہ کے گروہ) کے لقب سے سرفراز فرمایا اور ہر مقام پر
یاایھا الذین امنوا (جماعت مومنین) سے مخاطب کیا۔ بہرحال یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ اسلام نے آکر ایک نئی قوم
کی تخلیق کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی قوم بنی کیسے تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کے تمام مسلمان یکسر نو مسلم
تھے۔ کفر کو چھوڑ کر ایمان لائے تھے۔ پھر ان کے بعد کے مسلمان انہی نو مسلموں کی اولاد تھے سو اب غور فرمایئے کہ اس کے (Converts)
بعد گاندھی جی کی دلیل میں کیا وزن رہ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان چونکہ نو مسلم ہیں یا نو مسلموں کی اولاد ہیں اس لئے وہ
تبدیلیٔ مذہب سے قومیت تبدیل نہیں کر سکتے۔ اگر حضرت عمرؓ بن خطّاب اسلام لانے کے ساتھ ہی ایک جدید قوم کے فرد بن
گئے تھے۔ اگر حضرت عبداللہؓ بن عمر ایک نو مسلم (Converts) کی اولاد ہونے کے باوجود اُمّتِ مسلمہ کے فرد تھے اور اپنے والد
کی پرانی قومیت سے انہیں کوئی علاقہ نہیں رہا تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کا نو مسلم یا اس نو مسلم کی اولاد تبدیلیٔ مذہب
کے بعد بھی قومیت کے لحاظ سے ہندو کیسے رہے گی! آپ نے غور فرمایا کہ یہ خیال کہ یہاں کے مسلمان کبھی ہندو ہوتے تھے
کس طرح گاندھی جی کے سینہ پر سانپ بن کر لوٹ رہا ہے اور وہ کس طرح تلملا رہے ہیں کہ یہ نو مسلم اگر مذہب کو سرِدست
نہیں چھوڑ سکتے تو کم از کم اپنے دامنِ قومیت کو آبا و اجداد سے وابستہ نہ رکھیں۔ اس کے بعد انہیں پھر سے ہندو دھرم کے
آغوش میں لے لینا مشکل نہ ہو گا۔

☆

اب اس کے بعد ذرا زبان۔ لباس۔ خوراک۔ شکل و شباہت کی یکسانیت کو لیجئے جس کی بنا پر گاندھی جی ہندو۔ مسلمانوں
کو ایک قوم قرار دے رہے ہیں۔ اس کے لئے بھی آپ کو اسلام کے دورِ اُولیٰ کی تاریخ پر نگاہ ڈالنی ہو گی۔ کفار عرب میں سے
جو لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ ان کی زبان وہی تھی۔ لباس وہی تھا۔ کھانے پینے کے انداز وہی تھے (وہی کھجوریں اور وہی اونٹنی کا
دودھ) شکل و شباہت ایک جیسی تھی۔ میدانِ بدر میں ابو جہل اور ابوبکر صدیقؓ ایک جیسا لباس پہنے ایک جیسے ہتھیار باندھے۔
ایک سی زبان بولتے اور ایک جیسی شکل و شباہت لئے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ حتیٰ کہ مسٹر پٹیل آں جہانی کی طرح
ابو جہل و ابو لہب کی بھی ڈاڑھیاں موجود تھیں۔ لیکن ان تمام ظاہری یکسانیت کے باوجود ان دونوں (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور ابو
جہل) کے درمیان ایک اختلافِ عظیم تھا۔ ایک افتراقِ وسیع تھا اور وہ اختلاف کفر و ایمان کا اختلاف تھا جو ان دونوں کو دو الگ
الگ قوموں میں تقسیم کر کے۔ نسل۔ رنگ۔ خون۔ وطن کے اشتراک کے باوجود شمشیر بکف ایک دوسرے کے مدمقابل لے
آیا تھا اور اس انداز سے کہ باپ ایک طرف تھا اور بیٹا دوسری طرف۔ چچا ایک طرف اور بھتیجا دوسری طرف۔ داماد ایک طرف
تھا اور خسر دوسری طرف۔ یہ تھا اسلامی نقطۂ نظر قوموں کی تقسیم کے متعلق۔ ان میں کوئی ذاتی مخاصمت نہ تھی۔ تقسیم جائداد
کے جھگڑے نہ تھے۔ خاندانی رقابتوں کی مناقشت نہ تھی۔ اختلاف تھا تو صرف ایک اور وہ تھا فقط کفر اور ایمان کا۔
ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ایک قوم ہونے کے جس قدر معیار گاندھی جی نے قائم کئے ہیں ان میں سے کونسا معیار تھا جو ابو
جہل اور حضرت ابوبکر صدیقؓ میں مشترک نہ تھا۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود کیا آج کوئی شخص ایسا ہے جو یہ کہہ سکے کہ (نعوذ
باللہ) ابو جہل اور حضرت ابوبکرؓ ایک قوم کے فرد تھے! یہ جس قدر معیار گاندھی جی نے قائم کئے ہیں سب انسانوں کے وضع
کردہ ہیں۔ لیکن جس معیار کے مطابق ابو جہل و ابوبکر صدیقؓ مختلف قوموں میں تقسیم ہو گئے تھے وہ معیار خدا کا قائم کردہ تھا۔
لہٰذا جنہیں خدا نے دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہو۔ کونسا انسان ہے جو انہیں ایک قوم بنا سکتا ہے! یہ خدائی تقسیم کا ہی تو نتیجہ
تھا کہ ایک ہی ملک۔ ایک ہی شہر کے باشندے۔ ایک نسل۔ ایک قبیلہ ایک خاندان کے فرد۔ ایک زبان بولنے والے۔ ایک

جیسا لباس پہننے والے ایک جیسی ظاہری شکل و شباہت رکھنے کے باوجود۔ ابو جہل کی لڑکی کی شادی ابوبکرؓ کے لڑکے کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ ناجائز تھی۔ حرام تھی۔ اس وقت بھی حرام تھی اور آج بھی (ایک مسلم اور مشرک کی شادی) حرام ہے لیکن اس کے برعکس۔ اختلافِ وطن۔ اختلافِ نسل۔ اختلافِ رنگ۔ اختلافِ زبان۔ اختلافِ لباس کے باوجود بلالؓ حبشی کے نکاح کے لئے بڑے بڑے سردارانِ قریش اپنے ہاں کے رشتے پیش کرتے تھے۔ یہ کیا تھا! وہی خدا کی تقسیم کہ جونہی ایک شخص نے کہا

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وہ اپنے سابقہ تمام تعلقات کو منقطع کر کے ایک جدید قوم کا فرد ہو گیا۔ کہ جس طرح دنیا کی کوئی طاقت ایک قطرے کو سمندر سے الگ نہیں کر سکتی اسے بھی کوئی اس نئی قوم سے الگ نہیں کر سکتا!

یہ ہے مہاتما صاحب! اسلام کا معیار قومیت' یہ زمانہ علم و بصیرت کا عہد ہے۔ اس میں نری مہاتمائیت سے ہندوؤں جیسی پتھر پوجنے والی قوم میں تو کام چل سکتا ہے۔ فہم و دانش رکھنے والے ان باتوں سے نہیں بہلائے جا سکتے۔ اگر ہو سکے تو کوئی ایسی دلیل پیش کیجئے جو علم و دانش کے معیار پر بھی پوری اُترے اور اگر ظاہری یکسانیت ہی معیارِ قومیت ہے تو ذرا مہاتما جی سے پوچھئے کہ جرمنی کے یہودی اور وہاں کے ایک عیسائی میں شکل و صورت۔ لباس۔ وضع قطع۔ زبان وغیرہ میں کیا فرق ہے؟ اس کے باوجود وہ ایک قوم کے افراد نہ بن سکے۔ دُور کیوں جائے۔ ایک انگریز اور ایک جرمن کو لیجئے کوئی شخص ان کی ظاہری ہیئت سے ان میں تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن فرمایئے کہ کیا وہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بُت سے خدا سمجھے۔

☆

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک قوم نہ ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ قرآن کا خدا وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا لاجواب دلیل لائے ہیں۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ذرا ان سے پوچھئے کہ کیا گیتا اور انجیل کا خدا ایک نہیں! اگر ایک ہی ہے تو پھر انگریز اور ہندو مختلف قوموں کے افراد ہیں یا ایک ہی قوم ہیں۔ انگریزوں اور ہندوؤں کو کیوں الگ الگ قومیں قرار دیا جا رہا ہے؟ اور اشتراکِ معبودیت کے لئے صرف قرآن اور گیتا ہی کو کیوں مخصوص کیا گیا ہے؟ خدا ہی جانے یہ مہاتما جی کس آسمان سے بولتے ہیں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

☆

اور اس بیان کی آخری دلیل تو واقعی اس زمین کی نہیں۔ کسی آسمان سے اُتری ہوئی ہے۔ یعنی یہ کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی خدا کے عیال (Children) ہیں۔ اس لئے ایک ہی قوم کے فرد ہیں۔ یعنی ہندو اور مسلمان ایک خدا کی "اولاد" ہیں اور انگریز۔ جرمنی۔ فرانسیسی۔ اطالوی۔ حبشی۔ روسی یہ نعوذ باللہ الگ الگ خداؤں کی مخلوق ہیں۔ اس لئے الگ الگ قومیت رکھتے ہیں! اور اگر یہ بھی اسی ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں تو ساری دنیا کے انسان ایک ہی قوم ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کی اس میں تخصیص کیا ہے! سچ فرمایا ہے شیخ سعدیؒ نے کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اور پھر یہ بھی سنا آپ نے کہ مہاتما جی فرماتے ہیں کہ "یہ تصور کہ اسلام اور ہندو مت دو الگ الگ کلچر اور نظریاتِ حیات کے مذاہب ہیں میری روح میں بغاوت پیدا کرتا ہے۔ یہ تصور خدا کی ہستی سے انکار کے مرادف ہے"۔

ذرا جمیعت العلماء کو آواز دینا! وہ فرماتے تھے کہ "آزاد ہندوستان میں ایک ایسا شعبہ قائم ہو گا جو مسلمانوں کے مخصوص کلچر اور نظریاتِ حیات کا محافظ ہو گا اور ان سے متعلقہ احکام صرف وہی شعبہ جاری کر سکے گا"۔ ان کے رہبر کا تو فیصلہ یہ ہے کہ یہ خیال کہ اسلام کسی الگ کلچر کا حامل ہے۔ خدا سے انکار کا مرادف ہے!

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرما!

مثلاً مشہور ہے کہ "یہ نتھ بنوانے کو پھرے' وہ ناک کاٹنے کو پھرے"۔ یہ حضرات اسلامی کلچر کے تحفظ کے خواب دیکھ رہے ہیں اور مہاتما جی اس تصور ہی کو الحاد و زندیقیت قرار دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ "تنہا مہاتما گاندھی کی رہنمائی ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے"۔

(راشٹرپتی مولانا ابوالکلام آزاد)

یہ ہے برادران! گاندھی جی کے استدلات اور یہ ہے ان استدرات کی حقیقت۔

گاندھی جی اپنے ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا...... ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسری میں مدغم ہونی شروع ہو گئی ہیں...... لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں (ہندوستان ٹائمز مورخہ 5 مئی 1940ء)

ہمارا خیال ہے کہ اس مضمون میں گاندھی جی نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے [illegible] نگاہ کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اسلام ایک جداگانہ تشخص رکھتا ہے۔ اپنا الگ امتیازی نشان رکھتا ہے اور یہی جداگانہ [illegible] اور الگ امتیازی نشان ہے جسے اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ اور یہی تہذیب ہے جو ہر ہندو کے دل میں کانٹے کی طرح [illegible] ہے۔ اس لئے وہ چاہتا یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کا یہ امتیازی نشان مٹا دیا جائے۔

مسلمانوں سے پیشتر جتنے لوگ ہندوستان میں آئے۔ ہندوؤں نے ان کے ساتھ یہی کیا۔ ان کی تہذیب کو اپنے اندر مدغم [illegible] کیا اور جب وہ اپنے جداگانہ تشخص کو یوں کھو بیٹھے تو خود بخود ہندو قوم کا جزو بن گئے۔ یونانی۔ پارتھین۔ سھتین۔ [illegible] قومیں یہاں آئیں۔ لیکن آج ان کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ ان سب کو یہ اکال الامم نگل گیا۔ مسلمانوں کے [illegible] نے یہی کچھ کرنا چاہا۔ لیکن یہ ہڈی ذرا سخت تھی۔ آسانی سے نگلی نہ گئی۔ بایں ہمہ ہندو نے اپنی کوشش نہیں [illegible] برہمو سماج۔ کبیر پنتھ۔ سنت سنگ وغیرہ تحریکیں اسی کوشش ناکام کی مختلف شاخیں تھیں اور یہی کوشش آج [illegible] ایک ملک" کے نئے لباس میں جلوہ پیرا ہو رہی ہیں (واردھا کی تبلیغی اسکیم بھی اسی شاخ کا شگوفہ اور مولانا [illegible] سماجی تفسیر بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی تھی۔'

یہ تو ہے ہندوؤں کا نقطہ نگاہ۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا نظریہ۔ خود گاندھی جی کے الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان ایک الگ تہذیب رکھتے ہیں اور یہ تہذیب کسی دوسری تہذیب میں مدغم نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی دوسری قوم کا جزو نہیں بن سکتے۔ چونکہ لیگ کی یہ روش ہندوؤں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا رہی ہے اس لئے یہ اس کا اتنا بڑا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے! یہ سب کچھ گاندھی جی نے اپنے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اپنے قومیت پرست حضرات سے بالعموم اور ان میں سے حضرات علماء کرام سے بالخصوص دریافت کرتے ہیں کہ اس کے بعد ان کے پاس اپنے مسلک کے جواز میں کونسی دلیل رہ جاتی ہے؟ یہ حضرات ہمیشہ اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم اسلامی تہذیب کے محافظ ہیں۔ ہم ہندوستان کے مستقبل کے نظام حکومت میں اسلامی تمدن و تہذیب کے تحفظ کا پورا پورا انتظام کریں گے۔ ذرا غور فرمایئے کہ جو کچھ گاندھی جی فرما رہے ہیں اس کے بعد اسلام کی جداگانہ تہذیب اور اس تہذیب کے تحفظ کا کوئی سوال باقی رہ جاتا ہے؟ کیا یہی وہ چیزیں نہیں جس کی بنا پر مسلم لیگ کشتنی اور گردن زنی قرار دی جا رہی ہے؟ ہم حیران ہیں کہ یا تو یہ حضرات اس قدر سادہ لوح ہیں کہ اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور یا یہ اتنی گہری سازش ہے جس کے یہ حضرات دیدہ دانستہ کل پرزے بنے ہوئے ہیں! اس کے سوا کوئی تیسری چیز تو ہماری سمجھ میں آتی نہیں۔

اس کے بعد گاندھی جی اپنے محولہ صدر مضمون میں فرماتے ہیں کہ

"مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے انسان اور انسان میں رشتہ پیدا کر دے۔ کیا اسلام صرف ایک مسلمان ہی کو دوسرے مسلمان سے ملاتا ہے اور ہندو کی مخالفت سکھاتا ہے؟ کیا رسول (اکرمؐ) کا پیغام مسلمانوں کو اپنے اندر ہی امن و سلامتی کی تلقین کرتا تھا اور ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کرنا سکھاتا تھا؟ کیا ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں (کے قلب) کی پرورش اس چیز سے کی جائے گی جسے میں زہر ہلاہل کے سوا اور کچھ قرار نہیں دے سکتا۔ وہ لوگ جو اس زہر کو مسلمانوں کے دلوں میں بھر رہے ہیں وہ اسلام کے ساتھ بہت بڑی بدخواہی کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام یہ نہیں ہے۔ میں مسلمانوں میں ایک آدھ دن نہیں۔ مسلسل بیس برس سے رہتا چلا آرہا ہوں۔ مجھے تو کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا نہیں بتایا کہ اسلام۔ ہندو مت کے مخالف ہے") (ایضاً)

ہم گاندھی جی سے پوچھتے ہیں کہ ان کے اصول کے مطابق تمام انسان ایک جیسے ہیں---------- ان کا دھرم انہیں تمام انسانوں سے محبت و امن اور سلامتی کی تلقین کرتا ہے؟ جب ان کا دھرم انہیں یہ سکھاتا ہے تو وہ ہندوستان میں رہنے والوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کیوں لڑ رہے ہیں! کیا انگریز انسان نہیں اور کیا ان کی حکومت انسانوں کی حکومت نہیں ہے؟ پھر اس حکومت کو لعنت کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ کیا یہ ہندوسانی اور انگریز کی تفریق۔ انگریزوں کے خلاف جذبۂ منافرت پیدا نہیں کرتی؟ کیا گاندھی جی جذبۂ منافرت کی زہر ہندوستانیوں کے دلوں میں نہیں بھر رہے؟ کیا یہ ایک انسان کو دوسرے سے جدا کرنا نہیں؟ کیا ان کا دھرم صرف ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی کے ساتھ ملانے کا ہی سبق دیتا ہے۔ گاندھی جی کو یہ کہنا پڑے گا کہ ہندوستانی ایک جداگانہ قوم ہیں اور انگریز ایک جداگانہ قوم اور ان کی یہ تمام جدوجہد انگریز کے خلاف نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی تائید میں ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ان کا حق دلانے کی خاطر جنگِ آزادی لڑ

رہے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں۔ جرم اس وقت تھا جب انگریز کے ساتھ ظلم کیا جاتا۔ اس جواب کے بعد مسلمانوں کی پوزیشن کو سمجھئے۔ گاندھی جی کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز کرنے کا معیار وطن ہے اس لئے ان کے نظریہ کی رُو سے ہندوستان کے رہنے والے ایک الگ قوم اور انگریز ایک دوسری قوم ہیں اور ایک قوم کو کوئی حق حاصل نہیں کہ دوسری قوم پر غلبہ و تسلط حاصل کرے۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو اس کے خلاف جدوجہد کرنا کوئی جرم نہیں۔ اسی طرح اسلام نے بھی ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز کرنے کا ایک اصول قائم کیا ہے۔ وہ اصول وطنی حدود نہیں۔ بلکہ مذہب ہے۔ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے وہ ایک الگ قوم کا فرد ہو جاتا ہے۔ اور جو نہیں کرتا وہ دوسری قوم سے متعلق ہو جاتا ہے۔ بس اتنا فرق سمجھ لینے کے بعد باقی سب باتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے چونکہ ہندو ایک الگ قوم ہیں اسی لئے وہ ہندوؤں کے غلبہ و تسلط کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جس طرح گاندھی جی انگریز کے غلبہ و تسلط کو "بدیشی" قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط کو (خواہ وہ انگریز کا ہو یا ہندو کا) "بدیشی" (یعنی غیر اسلامی) سمجھنے پر مجبور ہیں اور اس غلبہ و تسلط کے خلاف پوری پوری جدوجہد کرنا ان کے نزدیک جہاد ہے' مقدس فریضہ مذہبی ہے۔ جس طرح گاندھی جی کے نزدیک یہ جدوجہد ایک قومی اور وطنی فریضہ ہے۔ مسلمانوں کی یہ جدوجہد نہ کسی کی مخالفت ہے۔ نہ امن و سلامتی کے منافی۔ اس لئے کوئی جرم نہیں۔ جرم اس وقت ہوتا جب یہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتے۔ ان پر ظلم کرتے۔

گاندھی جی انگریزوں سے اپنا حق چھیننے کے لئے یہ جدّوجُہد کریں تو وہ عین شرفِ انسانیت اور مسلمان ہندوؤں سے اپنا حق واپس لینے کے لئے جدّوجُہد کریں تو یہ انتہائی وحشت و بربریت!

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

باقی رہا اسلام کا (Anti-Hindu) ہونا۔ سو اگر (Anti) کے معنی ایسی مخالفت ہے جس میں ظلم و عدوان پایا جائے۔ تو اسلام دنیا میں قطعاً" (Anti-Hindu) نہیں۔ کسی مذہب کا بھی ایسا مخالف نہیں۔ کسی انسان کا بھی ایسا دشمن نہیں۔ اس لحاظ سے وہ سرتاپا امن و سلامتی کا پیغامبر ہے کہ وہ کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن اگر (Anti) سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے اور کسی کو حق پر نہیں مانتا۔ تو ہمیں اس امر کے اعلان کرنے میں قطعاً" تامل نہیں کہ اسلام دنیا کے ہر مذہب۔ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظریہ اور اپنے متعین کردہ نظام کے سوا دنیا کے ہر نظام کو باطل سمجھتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)

اللہ کے نزدیک اگر کوئی دین ہے تو صرف اسلام ہے۔ جو اس کے سوا کسی اور دین کو دینِ حق سمجھتا ہے تو باطل پرست ہے۔ اس کا وہ دین قطعی قابلِ پذیرائی نہیں۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (۳/۸۵) جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس کا وہ دین کبھی قبول نہیں کیا جاوے گا۔ اس نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بیان کیا ہے کہ وہ تمام ادیانِ عالم پر غالب آجائے۔

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دینِ حق کے ساتھ بھیجا کہ وہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے خواہ یہ بات

مشرکین کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ اس نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ **جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا** ۝ حق آگیا اور باطل دُور ہو گیا۔ کہ باطل کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ حق آنے پر وہ کافور ہو جائے۔

گاندھی جی کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر دس بیس برس کے عرصہ میں کسی مسلمان نے انہیں قرآنِ کریم کی یہ صریح آیات پڑھ کر نہیں سنائیں تو اس نے اسلام کے ساتھ غداری کی ہے اور گاندھی جی کے ساتھ فریب کاری۔ یہ یاد رہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ کسی تنگ نظری یا تعصب پر مبنی نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کا قانون ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ دو متضاد قوانین ایک ہی فطرت کے قانون نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اگر سنکھیا کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہلاکت کا موجب ہے۔ کوئی تعصب یا تنگ نظری نہیں تو کسی غیر اسلامی (یعنی غیر فطری) نظریۂ زندگی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ زندگی بخش نہیں (لہٰذا باطل ہے) کوئی برائی نہیں "مذہبی جنون" نہیں حق کو حق کہنا عین انصاف ہے۔ خواہ اس سے ساری دنیا ناراض کیوں نہ ہو جائے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے (مولانا محمد علی مرحوم)

پھر گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ذرا ان مسلمانوں کو دیکھئے ان کے نزدیک۔

"ہندو حکومت کے ماتحت رہنا گناہ ہے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت بھی ان کے نزدیک ناقابل تصور ہے"۔ (ایضاً)

لیکن مہاتما جی نے اتنا نہیں سوچا کہ خود ان کی اپنی کیا حالت ہے۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت کا تصور ان کا خون کھولا رہا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ اس اسکیم کی مخالفت میں اپنے اہمنا کی پوری قوتیں صرف کر دیں گے۔ حالانکہ گاندھی جی پر اس کے متعلق کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہم باب اول میں لکھ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک کسی غیر مسلم کی حکومت کے ماتحت رہنا گناہ ہی نہیں بلکہ غیر اسلامی زندگی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت کا تصور بھی روحِ اسلامی کے منافی ہے۔ اس لئے مسلمان اگر ایسی حکومت کے ماتحت رہنے کو گناہ سمجھتے ہیں تو بالکل حق بجانب ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ویسی ہی غلامی ہے جیسی انگریز کی خواہ یہ خالص ہندوؤں کی حکومت ہو یا ایسی حکومت جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہو دونوں قرآن کی رو سے ناجائز اور اس لئے مسلمانوں کے لئے ناقابلِ قبول ہیں۔ **وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ** ۔ مصیبت یہ ہے کہ گاندھی جی۔ یا ان کے ہمنوا حضرات کو اسلام کے متعلق واقفیت تو کچھ ہے نہیں اور دعویٰ ہمہ دانی کا کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ مصیبت کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ان کے حاشیہ نشیں ہیں وہ بھی یا تو روحِ اسلامی سے بالکل کورے ہیں یا اگر اس سے واقف ہیں تو اس جرأتِ ایمانی سے محروم ہیں جو ان میں حق گوئی کی قوت پیدا کر دے۔ نتیجہ یہ کہ گاندھی جی آئے دن اس قسم کے فتاویٰ صادر فرماتے رہتے ہیں کہ فلاں چیز اسلام کے خلاف ہے اور فلاں نظریہ اسلام کے عین مطابق ہے اور قومیت پرست "علماء کرام" سب کچھ سنتے ہیں اور ایک لفظ تک اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندو اربابِ سیاست کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کیا جائے تو اس کے بعد وہ اپنے خفیہ منصوبوں کو اسلام کے نقاب میں پیش کرنے کی جرأت تو نہ کر سکا کریں۔ لیکن آج یہ کون کرے۔ ایک کرنے والے تھے انہیں بھی کار پردازانِ قضا و قدر نے ہم سے چھین لیا۔ سچ کہا تھا اس مردِ قلندر نے کہ

از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مرد

(اقبالؒ)

پھر گاندھی جی فرماتے ہیں۔

"اگر پاکستان محض ایک دھمکی ہی نہیں بلکہ ایک قابلِ قبول (Desirable) نصب العین ہے تو پھر اس کی مخالفت کیوں کی جائے۔ لیکن اگر یہ ناقابلِ قبول (Undesirable) ہے اور اس سے مقصد محض یہ ہے کہ مسلمان اس کی آڑ میں زیادہ کچھ حاصل کر لیں تو پھر اس کا کوئی حل بھی ہو۔ وہ ناانصافی پر مبنی ہو گی اس لئے میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں کہ کب یہ پتا دُور ہو"۔ (ایضاً)

"یہ زیادہ حاصل کرنے" کا طعنہ بھی آپ نے سنا؟ ایک کم تولنے والے بنیا سے اگر آپ لڑ جھگڑ کر پورے تول کا سودا خرید لیں۔ تو آپ کے معیار کے مطابق وہ پورا ہو گا۔ لیکن بنیا کے نزدیک وہ زیادہ ہو گا۔ مسلمان چاہتے کیا ہیں۔ فقط اتنا کہ جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور گاندھی جی کے نزدیک مسلمان ڈرا دھمکا کر زیادہ کچھ حاصل کرنے کی ٹھان رہے ہیں۔ گاندھی جی کے نزدیک "پورا تول" تو اس وقت ہو گا جب مسلمان خاموشی سے اکثریت کی حکومت قبول کر لیں اور اس کو آزادی قرار دیدیں۔ لیکن گاندھی جی سے کہدیجئے کہ وہ سوداگر گئے جو اس قسم کے سودے کیا کرتے تھے۔

اس عہد میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

☆

غیر مسلم اقلیتیں اس اسکیم کی مخالفت میں جو سب سے بڑا حربہ ستعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ غیر مسلم اقلیتوں کو یہ کہکر مشتعل کرنا ہے کہ اس اسلامی حکومت میں تمہارے حقوق پامال ہو جائیں گے۔ اس لئے تمہیں پورے زور اور قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کرنی چاہئے چنانچہ اس باب میں پنجاب کے سکھوں کو بہت زیادہ بھڑکایا جا رہا ہے۔

قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں دینا چاہتے۔ یہ حکومت ضابطۂ قرآنی کے ماتحت ہو گی۔ اس لئے اس کے جواب کے لئے قرآنِ کریم کا مطالعہ کر لینا کافی ہے۔ قرآن کوئی "گپت وِدّیا" (علم مخفی) نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں۔ جس کا جی چاہے اٹھا کر دیکھ لے کہ اس کی رُو سے غیر مسلموں کو کس درجہ آزادی حاصل ہو گی۔ "اسلام اور مذہبی رواداری" ایک جداگانہ عنوان ہے اور اس عنوان پر ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے ایک مفصّل پمفلٹ شائع ہو چکا ہے اس کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قدر عدل و انصاف کا سلوک ہو گا۔ ایسا سلوک کہ جب حمص کی عیسائی رعایا کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا رہے ہیں تو وہ روتے تھے اور منتیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے تم نے جلدی واپس آجانا۔ کہیں ہمیں دوبارہ رومیوں کے ماتحت نہ ہو جانا پڑے اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ رومی کون تھے؟ عیسائی تھے! یعنی عیسائی رعایا یہ کہہ رہی ہے کہ ہم مسلمانوں کی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں۔ عیسائیوں کی حکومت میں نہیں رہنا چاہتے۔ حُسنِ سلوک اور تحفظِ حقوق کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟

قرآن کریم تو یہاں تک حکم دیتا ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ۵ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔

یعنی اسلام تو دشمن سے بھی عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جن کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے خود لے لی ہو۔ اس باب میں قرآنِ کریم۔ احادیث۔ آثار و شواہد اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتی کہ اسلام اپنی غیر مسلم رعایا سے کس حسن سلوک کا برتاؤ کرتا ہے۔

علاوہ بریں۔ ذرا ایک ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر تمام ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت قائم کیا جائے تو ہندو اکثریت۔ اقلیتوں کے تحفظِ حقوق کی ذمہ دار ہو گی۔ یعنی وہ ہندو جس کے مذہب میں کوئی غیر ہندو انسان بھی نہیں کہلا سکتا۔ اسے "ملیکش" کہا جاتا ہے۔ وہ غیر ہندوؤں کے حقوق کی نگہداشت کریں گے! وہ ہندو جن کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے ہزارہا سال سے کروڑوں اچھوتوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے اور ان کا یہ سلوک ان کے ذاتی رجحانات کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کا مذہب انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسا ہی کریں۔ ان ہندوؤں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان پر پورا پورا اعتماد کرو۔ یہ اقلیتوں کے ساتھ مساوات کا سلوک کریں گے۔ ان سے پوچھئے کہ آپ نے آج تک خود "اپنوں" کے ساتھ کیا کیا ہے جو دوسرے آپ پر بھروسہ کریں!

ان ہندوؤں پر تو بھروسہ کرو۔ لیکن مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرو۔ جن کا مذہب انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ کبھی کسی حال میں بھی جادۂ عدل و انصاف سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پائیں۔ وہ مسلمان جن کی تاریخ کے اوراق آج بھی دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی حکومت میں غیروں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ مسلمان جن کی عطا کردہ جاگیریں آج بھی ہندوؤں کے سینکڑوں مندروں کی کفالت کا موجب ہیں۔ وہ مسلمان جن کا قرآن انہیں حکم دیتا ہے کہ غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی اسی طرح کرو جس طرح تم اپنی مساجد کی حفاظت کرتے ہو (القرآن) وہ جن کا مذہب انہیں تلقین کرتا ہے کہ غیر مذہب کے معبودوں (بتوں تک) کو بھی گالی نہ دو۔ وہ مذہب جو انسانیت کا اس درجہ احترام سکھاتا ہے کہ اس کے نزدیک کسی ایک جان کا ناحق ضائع کرنا گویا تمام نوع انسانی کو ہلاک کر دینا۔ اور کسی ایک نفس کا بچا لینا تمام انسانیت کو زندگی عطا کر دینا ہے (القرآن)

کہا جا سکتا ہے کہ جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ انہیں غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں مذہب کی آزادی نہیں مل سکتی تو غیر مسلم اقلیتیں یہ کیسے باور کر لیں کہ انہیں مسلم اکثریت کی حکومت میں مذہب کی آزادی مل جائے گی۔ اعتراض بظاہر معقول نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے جواب کے لئے ذرا بابِ اوّل پر ایک نگاہ پھر سے ڈالئے اور دیکھئے کہ ایک مسلمان کے نزدیک "مذہب کی آزادی" کا مفہوم کیا ہے اور ایک غیر مسلم کے نزدیک مذہبی آزادی کسے کہتے ہیں۔ مسلمان کا مذہب اس کی حکومت ہے اور مذہبی آزادی سے مفہوم ایک آزاد حکومت کا قیام ہے۔ برعکس اس کے دیگر اہلِ مذاہب میں مذہب سے مفہوم چند عبادات و رسومات کی ادائیگی ہے۔ اس سے آگے امورِ دنیاوی کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ آپ نے آج تک کسی ہندو۔ سکھ۔ پارسی وغیرہ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہو گا کہ انگریز کے عہدِ حکومت میں انہیں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ملکہ وکٹوریا کے منشور میں جس قسم کی مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا تھا وہ آزادی تمام غیر مسلم اہلِ مذاہب کے معیار پر پوری اُترتی ہے۔ اس قسم کی مذہبی آزادی اسلام بھی دیتا ہے اور صرف آزادی ہی نہیں دیتا بلکہ ان کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ برعکس اس کے مسلمان کو دنیا میں کوئی حکومت مذہبی آزادی نہیں دے سکتی کہ ان کا مذہب آزاد نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ حکومت بھی ان کے اپنے

ہاتھ میں نہ ہو۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام کی آزادی اور دیگر مذاہب کی آزادی میں۔ اس لئے تمام غیر مسلم اقلیتوں کو بالکل مطمئن رہنا چاہئے کہ مسلمان تو از روئے مذہب مجبور ہے کہ وہ انہیں مذہبی آزادی دے اور اس آزادی کی ضمانت کے لئے وہ جس قسم کی شرائط چاہیں ان سے لکھوا لیں۔ انہیں کسی قسم کا اعتراض ہی نہ ہو گا۔ بلکہ ان شرائط کی پابندی تو ان پر بطور فریضۂ مذہبی لازم ہو گی۔ مسلمان حاکم نہیں ہوتا۔ تحفظِ حقوق انسانیت کے لئے چوکیدار ہوتا ہے۔ اور خوف چور سے ہوتا ہے چوکیدار سے نہیں!

آزاد مسلم کانفرنس کے اعتراضات

کانگریس مسلم لیگ کی اسکیم زیر نظر کی مخالفت فرداً فرداً ہر ایک قومیت پرست سے لے کر آئی۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ انفرادی ہنگامہ آرائی بالکل بے نتیجہ ہے کیونکہ لیگ کی اسکیم کی تائید ایک اجتماعِ عظیم نے کی تھی جس میں اطراف و اکنافِ ملک کے مسلم نمائندے شامل تھے۔ اس لئے سوچا گیا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ان قومیت پرست حضرات کی آواز کو بھی جمہور کی آواز بنا کر دکھا دیا جائے۔ لیکن اس تجویز کے راستہ میں سب سے بڑا روڑا خود قومیت پرستی کا لیبل تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت اب ایک دنیا پر ثابت ہو چکی ہے کہ قومیت پرستی ہندو پرستی کا ہی دوسرا نام ہے۔

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز ہے

اس لئے سب سے پہلے گراموفون کے ان ریکارڈوں سے قومیت پرستی کا پرانا لیبل کھرچا گیا اور اس کی جگہ "آزاد مسلمان" کا نیا لیبل لگا لیا گیا۔ پھر ان آزاد گانِ مذہب و ملت کو اواخر اپریل میں دہلی کے مرکزی مقام میں جمع کیا گیا۔ اور ہندو اخبارات نے چاروں طرف اس اجتماع کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ کہیں سرخیلِ آزاد گان جناب خان بہادر اللہ بخش کے متعلق لکھا گیا کہ ایک ازدہامِ عظیم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ حالانکہ ان بڑے بڑے مولوی صاحبان سے پوچھئے کہ سوائے ان سات آٹھ حضرات کے۔ جن کا فوٹو خان بہادر صاحب کے ساتھ چھپا ہے۔ کوئی اور اسٹیشن پر موجود بھی تھا؟ (واضح رہے کہ یہ بڑھ بڑھ کر فوٹو کھنچوانے والے حضرات وہی علمائے کرام ہیں کہ فوٹو کی حرمت کے متعلق جن کے فتاویٰ آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں) کہیں صدر کانفرنس کے جلوس میں چالیس ہزار نفوس بتائے گئے۔ کہیں جلسہ کے متعلق لکھا گیا کہ پنڈال کے اندر پچیس ہزار کا مجمع تھا اور اگر پنڈال سے باہر کے لوگ بھی شامل کر لئے جائیں تو ایک لاکھ کا اجتماع سمجھئے (اس لئے کہ ان پروپیگنڈہ کرنے والوں نے دیکھا تھا کہ مسلم لیگ کے جلسہ میں اتنا ہی اجتماع تھا۔ اس سے انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ کانفرنس بھی لیگ سے کچھ کم نمائندہ حیثیت نہ رکھتی تھی) حالانکہ دہلی والے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ان اجتماعات کو دیکھا تھا۔ خوب جانتے ہیں کہ پنڈال کتنا بڑا تھا اور اس میں حاضرین کی تعداد کس قدر تھی اور اگر ان میں سے عربی مدارس کے ان طالب علموں کو الگ کر دیا جائے جنہیں خاص طور پر جلسہ میں لایا گیا تھا اور ہندوؤں کو بھی خارج کر دیا جائے تو پھر باقی یا تو پنڈال رہ جاتا ہے یا اس کے منتظمین و مندوبین۔ یہ اجتماع یوں منعقد کرایا گیا۔ اس کی غرض و غایت کیا تھی! یہ ان قاری صاحب نے بتا دیا جنہوں نے جلسہ کی کارروائی کا افتتاح قرآن کریم کی ان آیات مقدسہ سے کیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (۴۱/۲۶)

اور یہ (حق سے) انکار کرنے والے (آپس میں) کہتے ہیں کہ اس قرآن (کی آواز) کو مت سنو بلکہ (ایسے وقت میں) خوب شور مچاؤ۔ شاید (اس طریقہ سے) تم کامیاب ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان قرآنِ کریم کو محض تبرکاً

اور رسماً" پڑھ دیتے ہیں۔ اس لئے معانی کی طرف کبھی ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ ورنہ وہ خود محسوس کرتے کہ ان کے اس شور و غوغا کے متعلق قرآنِ کریم کی بارگاہ سے کیا فتویٰ صادر ہو رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب قاری صاحب اس سے آگے چوتھی آیت پر پہنچے ہیں تو ہم قرآنِ کریم کے اس اعجاز پر وجد کر رہے تھے کہ وہ کس طرح ان حضرات کی زبان سے غیر شعوری طور پر حقیقت کا اعتراف کرا رہا ہے۔ انہوں نے پڑھا کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ○ (۴۱/۲۹)

اور یہ (حق سے) انکار کرنے والے (قیامت میں) کہیں گے کہ یااللہ! ذرا ہمیں جن و انس میں سے ان لوگوں کو دکھا دے جنہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا تھا۔ کہ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں اور انہیں یوں ذلیل و خوار کریں۔

اور پانچویں آیت میں تو حق پر چلنے والوں کے لئے تسکین و طمانیت کی ایک کھلی ہوئی شہادت تھی **اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (۴۱/۳۰)**

(اور) جن لوگوں نے کہدیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے (ان کے قلوب کو تسکین و طمانیت دینے کے لئے) ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ مت خوف کھاؤ۔ بالکل نہ گھبراؤ اور اس جنت کی بشارت لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

ان آیات کی تلاوت تو رسماً" کرا دی گئی لیکن اس کے بعد (نہ حمدِ خدا نہ نعتِ رسول بلکہ) یکے بعد دیگرے وطن کے دیوتا کے چرنوں میں عقیدت و ارادت کے پھول چڑھائے گئے۔

"جھنڈا ہے بلند ہمارا بڑھے وطن کی شان" اور "اے وطن اے وطن۔ اے وطن" کی قسم کے قومی ترانے گائے گئے اور جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی۔ ہم تین دن برابر دیکھا کئے کہ بالآخر یہ علماء حضرات کا مجمع ہے۔ اس میں کسی گوشہ سے قال اللہ۔ قال الرسولؐ کی آواز بھی اٹھتی ہے۔ یا نہیں لیکن سنئے اور حیران ہو جیئے کہ سارے جلسہ کی کاروائی میں کسی شخص کی زبان پر نہ اللہ کا نام آیا نہ اس کے رسولؐ کا نام۔ نہ اسلام کا ذکر آیا نہ اس کی ناموس کا۔ "وطن پر مصیبت آگئی ہے" بھارت ماتا گردابِ بلا میں گھر چکی ہے"۔ قوم پر غربت و افلاس کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہندی بھوکوں مر رہے ہیں اور اس قسم کے دیگر "مقدس" مقتضیات تھے جن کی بناء پر "مسلمانوں" کے جذبات اُبھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم نے مضمون زیر نظر کی اشاعت کو مئی کے پرچے سے قصداً" روک لیا تھا کہ اس کانفرنس کے اعتراضات کو بھی دیکھ لیا جائے۔ لیکن ہمیں اب افسوس ہوا کہ اس کی اشاعت میں یونہی تاخیر روا رکھی' کانفرنس میں لفظاً" لفظاً" انہی اعتراضات کو دہرایا گیا جو اس سے پیشتر مختلف کانگریسی لیڈروں کے زبان و قلم سے نکل چکے تھے البتہ فرق یہ تھا کہ اربابِ کانفرنس کے لب و لہجہ میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تلخی زیادہ تھی۔ صدر استقبالیہ کمیٹی نے علیحدگی کی اسکیم کو "نامعقول" اور ایسے دماغ کی تخلیق قرار دیا جو "غصہ" کی وجہ سے ماؤف ہو چکا ہو" اور اپنے فیصلہ کی تائید میں کسی ایک دلیل کے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اسی طرح جناب صدر نے اسے "مہمل اور نقصان رساں" قرار دے کر یہ تصور کر لیا کہ انہوں نے دلائل قاطع و براہین ساطع سے اس اسکیم کی تردید فرما دی ہے۔ جو کچھ ان تین چار روز میں کہا گیا ہے۔ اس کا ملخص حسب ذیل ہے۔ پہلے جناب صدر کے ارشادات کو لیجئے۔ وہ اپنے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں۔

(1) اسلام کا عالمگیر پیغام الگ الگ قوموں کو اپنا ہم خیال بنا کر ان کی قومی وحدتوں کو ختم نہیں کر دیتا۔ مثال کے طور پر اگر جرمنی۔ انگلستان۔ فرانس۔ جاپان کے رہنے والے مسلمان ہو جائیں تو کیا یہ لازم آئے گا کہ وہ اپنی قومیت سے دستکش ہو جائیں۔ اپنی معاشرت کو بدل دیں اور اپنے تمدن کو خیر آباد کہدیں۔ اسلام اگر تمام انسانیت کے لئے ہے اور اسلام کا خدا سب قوموں کا خدا ہے۔ تو کسی خاص نسل۔ یا قوم۔ یا ملک تک اس کی وسعت کو محدود کر دینا کیسے ممکن ہے۔ اسلام نسلوں سے بالاتر ہے۔ فرقوں اور قوموں سے بالاتر اور جغرافی اور ملکی حدوں سے بالاتر ایک عالمگیر نظام کا نام ہے اور یہ ایک کھلا ہوا دھوکا ہے اور ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بے حد نقصان دہ اور تباہ کر دینے والا ہو گا اگر آج ہمیں مذہب کی بنیاد پر الگ الگ قومیں بنانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

جناب خان بہادر صاحب! جرمنی۔ انگلستان۔ فرانس یا جاپان کے رہنے والے اگر آج مسلمان ہو جائیں تو انہیں ان قومیتوں سے سب سے پہلے دستکش ہونا پڑے گا جن کی بنیاد انسانی ہاتھوں نے نسلی اور جغرافیائی حدود پر رکھی ہوئی ہے۔ جب اسلامی وحدت پیدا ہوتی ہے تو یہ غیر اسلامی نسبت جسے آپ "قومی وحدتیں" قرار دے رہے ہیں سب فنا ہو جاتی ہیں۔ صہیبؓ رومی۔ بلال حبشیؓ۔ سلمان پارسیؓ۔ حضرت عمر عربیؓ۔ جب اسلام لائے تھے تو ان سب کی الگ الگ "قومی وحدتیں" اس ایک عالمگیر وحدت میں جذب ہو گئی تھیں جسے ملت اسلامیہ کہتے ہیں۔ آج آپ کی سمجھ میں یہ بات اس لئے نہیں آسکتی کہ آپ نے مغرب کے معیار قومیت کو "خدائی قانون" مقرر کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ جس وقت بھی سوچتے ہیں تو اسی قانون کی حدود و قیود کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کو سامنے رکھ کر کچھ سوچتے تو اس بات کا سمجھ لینا زیادہ مشکل نہ تھا۔

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

لیکن یہ "بت خانہ" انہی کے دماغ کا نہیں اس کی ابتدا تو اس دن ہوئی تھی جب ایک بہت بڑے شیخ الحدیث نے فتویٰ ارشاد فرمایا تھا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" اور پھر یہ بھی سن رکھئے کہ جب دنیا کی کوئی قوم اسلام لائے گی تو اسے اپنے معاشرت و تمدن کے ہر اس عنصر کو چھوڑ دینا پڑیگا' جس کی روح اسلام کی روح کے خلاف ہو گی۔ خواہ وہ معاشرت آپ کی نگاہ میں کیسی حسین و جاذب نظر کیوں نہ ہو۔ ہاں! یہی تو وجہ ہے کہ اسلام وطن کی چار دیواری یا نسلی امتیازات کی آب و گل میں محبوس نہیں ہو سکتا کہ اس کا خدا تمام ملکوں اور قوموں کا خدا ہے اور یہ پابندیاں اس کی لامحدود وسعت کو محدود کر دیتی ہیں۔ اسلام واقعی "جغرافیائی اور ملکی حدوں سے بالاتر ایک نظام کا نام ہے"۔ سوچئے آپ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کے بعد نتیجہ کیا نکال رہے ہیں۔

اس کے بعد بھی آپ اگر سمجھتے ہیں کہ "مذہب کی بناء پر الگ الگ قومیں بنانے کی دعوت ایک دھوکہ ہے اور نقصان رساں اور تباہ کن دھوکا ہے۔ تو یہ آواز نئی نہیں ہے۔ یہ آواز بھی ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی یہی کہا گیا تھا کہ

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ — از دمِ اُو کعبہ را گُل شُد چراغ!
مذہب اُو قاطع ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ اُو یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتان حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دور مانے ریختند

(جاوید نامہ۔ نوحہ روح ابو جہل در حرم کعبہ)

احمر و اسود کا یہی امتیاز تھا جسے قائم رکھنے کے لئے اس وقت واویلا کیا گیا تھا اور اسی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے آج یہ شور اُٹھایا جا رہا ہے کہ ایک انگریز اسلام لانے کے بعد اپنی قومیت سے دستکش نہیں ہو سکتا" غور فرمایئے! کیا ان دونوں آوازوں میں کچھ بھی فرق ہے۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

(2) متحدہ قومیت کے متعلق دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے۔

"ہیر و رانجھا۔ سسی پنوں کے قصے۔ جن کے لکھنے والے مسلمان تھے۔ آج سندھ اور پنجاب۔ مسلمان ہندوؤں۔ سکھوں سب کا مشترکہ سرمایہ ہے اور سب بغیر کسی اختلاف کے ان کو پڑھتے۔ ان سے حظ اٹھاتے اور ان کو اپنا سمجھتے ہیں۔

سبحان اللہ ! کیا مسکت دلیل ہے ! کیوں صاحب ! اگر کوئی انگریز یہ کہدے کہ شیکسپیئر و ملٹن کو آج تمام ہندوستان مزے لے لیکر پڑھتے ہیں اور ان سے حظ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے انگریز اور ہندوستانی ایک ہی قوم ہیں۔ لہٰذا انگریزوں کی حکومت کو اپنی ہی قومی حکومت سمجھو! تو فرمایئے جناب خان بہادر صاحب اس کا کیا جواب بن پڑیگا۔

(3) پھر ارشاد ہے۔

"ہندوستان ایک نہ تقسیم ہونیوالی جغرافی وحدت ہے"" اس کے لئے دلیل ! کیا قرآن کریم میں ایسا لکھا ہے !

(4) فرماتے ہیں۔

"ہم سب اس سارے ملک کے مالک ہیں اور کوئی تبلیغی ڈھونگ اور سیاسی فریب ہمیں اس عقیدہ سے نہیں ہٹا سکتا"۔

مالک تو ضرور ہیں۔ لیکن جب ملکیت سے متمتع ہونے کا وقت آتا ہے تو پھر اس کی کیفیت اس گائے کی سی ہو جاتی ہے جس کے سینگ مسلمانوں کے حصہ میں آتے ہیں اور دودھ ہندو دوہتا ہے اور پھر آپ نے "تبلیغی ڈھونگ" اور "سیاسی فریب" کے الفاظ پر بھی غور فرمایا؟

(5) اسلامی حکومت کے قیام کے متعلق فرماتے ہیں۔

"ہندو اور مسلم حکومت کے خواب جو آج بعض لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی پوشیدہ آرزوؤں کی آخری مہر ہے..... یہ جاہ پرست طبقہ اپنی آنکھیں کھولے اور جاہ پرستی کا انجام دہلی کے کھنڈروں میں دیکھ کر اپنی حرکتوں سے باز آئے۔ بدقسمتی سے دوسروں کو گرا کر خود آگے بڑھنے کی ہوس اور دوسروں پر کھلم و کھلا کسی داؤ فریب سے حکومت کرنے کا ولولہ جاہل اور غیر مہذب لوگوں کو بہت پسند ہوتا ہے ..... جو دوسروں کو اپنا سیاسی محکوم اور معاشی غلام بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں، میں نہایت خلوص سے ان کو مشورہ دونگا کہ وہ اس خواب و خیال کی دنیا کو جتنی جلدی ہو سکے چھوڑ دیں تو ان کے لئے بہتر ہے .....

ضرورت ہے کہ اس بات کو جاہ پرست طبقے خوب اچھی طرح سن لیں اور اپنے دلوں سے کسی ایسے نظام کا خیال نکال دیں جس کے ذریعہ مسلمان عوام کو اُلّو بنا کر سیاسی اور معاشی لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے منصوبے سوچ رہے ہیں۔

سن لیا آپ نے ! جن باتوں کو برملا کہنے سے ہندوؤں کی زبانیں لڑکھڑاتی اور آنکھیں شرماتی تھیں۔ ان باتوں کو مسلمان کے اس اجتماع کے صدر کی زبان سے کس جرأت و بیباکی سے ادا کرایا جا رہا ہے ! یعنی ہندو اگر اس ملک میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرے تو وہ جنگ آزادی ہے۔ جہاد حریت ہے۔ انسانیت کا سب سے مقدس فریضہ ہے اور اگر مسلمان اسلامی حکومت کے جذبہ کو پرورش دیں تو وہ جاہ پرستی ہے۔ ہوسناکی ہے۔ داؤ فریب ہے۔ استبداد ہے۔ تغلب ہے۔ غصب و لہب ہے۔ غیر مہذب' قوموں کا شیوہ ہے۔ غرضیکہ عالم انسانیت کی ذلیل ترین حرکت ہے !

اور پھر ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ جاہ پرستی کا طعنہ کون دے رہے ہیں ! جناب خان بہادر اللہ بخش صاحب۔ کہ ہوسِ وزارت میں جن کی مضحکہ انگیز حرکتوں نے فضائے ہند کو اب تک کشتِ زعفران بنا رکھا ہے کہ آج بھی جب کہیں ان کا فوٹو سامنے آتا ہے تو بے اختیار ایک تأسف انگیز و عبرت آمیز ہنسی کا محرک ہو جاتا ہے۔

(6) پھر ارشاد ہے۔

"ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے کانگرس کی نمائندہ حیثیت تو سمجھ میں آتی ہے ..... لیکن جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے۔ سوائے ہنگاموں اور جلسوں کے اور آخر کس بنیاد پر وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی نمائندگی کا امتحان اس وقت ہو گا جب لیگ اپنے لاہور والے ریزولیشن کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور اس ایک مسئلہ پر از سرنو انتخاب لڑا جائے گا"

مسلم لیگ کس بنا پر مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے؟ اس کا جواب اپنے آقایان نعمت جناب گاندھی جی و شرکاہم سے پوچھئے جو بیس مرتبہ تسلیم کر چکے ہیں کہ لیگ مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی نمائندہ ہے۔ باقی رہا امتحان کا سوال۔ تو اس کے لئے جناب سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب' خان بہادر صاحب کو پہلے ہی چیلنج دے اسمبلی سے استعفیٰ دیکر آئیں اور لاہور والے ریزولیشن کے مسئلہ پر از سرنو انتخاب لڑیں۔ اگر ہمت ہے تو خان میں آئیں۔ نتیجہ دنیا کے سامنے خود بخود آجائے گا۔

لطیفہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

امر یہ ہے کہ آج جو مسلمان مرکزی حکومت کے ماتحت مرکزی سروسوں میں ہندوستانی ہونے قائم ہو جانے کے بعد انہیں غیر ملکی سمجھ کر ان کی خدمات سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔

سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چند ملازمتوں اور نشستوں کیلئے لڑتی اٹھائے تو اس قدر ذلیل بن جاتا ہے۔ وہی مسئلہ لیگ کی اسکیم کی

کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اس کیلئے زیادہ نہیں تو اسمبلی کے مینہ کی طرح سامنے آجائے گی۔

نقصان رساں۔ جاہ پرستی کا اندھا جذبہ۔ مہمل اور دوراز کار قرار دیا

گیا ہے۔

"خیر گذری جو تُو خدا نہ ہُوا"

دعا کیجئے کہ ان کی یہ مساعی مشکور قرار پائیں اور بارگاہِ واردھا سے ان کی پچھلی تقصیریں معاف ہو کر انہیں "نجات" کا پروانہ مل جائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

مقتدی حضرات یہ تو تھے خطبۂ صدارت کے جواہر ریزے۔ اب مختلف مقررین اور موئیدین حضرات کے ارشادات گرامی میں سے بھی کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ ارشاد ہے۔

(1) یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستہ میں روڑا اٹکاتی ہے۔ (خان بہادر اللہ بخش)

(2) ہندوستان میں برطانوی تسلط کو قائم رکھنے کا حیلہ ہے۔ (عبدالرحمٰن سرحدی)

(3) یہ اسکیم برطانوی حکومت کو قائم رکھے گی اور برطانیہ عظمیٰ کے مفاد کے لئے ہندوستان اور بیرونی ممالک کے درمیان ایک Buffer State کا کام دے گی' (مولانا حفظ الرحمٰن صاحب)

(4) یہ اسکیم ان حضرات کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جن کے پیش نظر تمام ملک کا مفاد ہے۔ (سر غلام حسین ہدایت اللہ)

(5) ملک کے مفاد کے لئے بالعموم' مسلمانوں کے مفاد کیلئے بالخصوص نقصاں رساں ہے۔ (مولانا حبیب الرحمٰن)

(6) ایک شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ (سر غلام حسین ہدایت اللہ)

(7) اس اسکیم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ (حافظ محمد ابراہیم)

(8) یہ عوام کے مفاد کا تحفظ نہیں کرے گی۔ بلکہ خواص اس سے متمتع ہوں گے۔ (مسٹر محمد امین کھوتو)

(9) کہا یہ جاتا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر جو مفروضہ مظالم ہوئے ہیں پاکستان اسکیم ان کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ مظالم تو پاکستان کے بعد بھی ویسے ہی ہوتے رہیں گے..... یہ جو کہا جاتا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم ہوئے ہیں تو اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں۔ اگر ان صوبوں میں لیگ والے بھی صاحب اختیار ہوتے تو وہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے جو کانگریس نے کیا ہے (حافظ محمد ابراہیم۔ سابق وزیر یو۔ پی)

ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں۔ طلوع اسلام)

(10) مالیات اور دفاع کے نقاطِ نگاہ سے یہ اسکیم ناقابل عمل ہے (خان بہادر اللہ بخش)

(11) اس اسکیم میں اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے (مولانا حبیب الرحمٰن)

(12) اس اسکیم کے بعد اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمان اپنے حقوق سے محروم رہ جائیں گے۔ (عبداللہ القاضی)

(13) اگر سرحد۔ بلوچستان اور سندھ کے مسلمان اس اسکیم سے الگ ہو جائیں تو پنجاب کا پاکستان ایک دیسی ریاست کے برابر رہ جائے گا۔ (خان بہادر اللہ بخش)

(14) یہ بااختیار صوبوں کو دیسی ریاستوں کے درجہ تک پہونچا دیگی (مولانا حبیب الرحمٰن)

(15) مسلمانوں پر یہ مذہبی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیں۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو منطقوں کے اندر مقید نہیں کر سکتے (مفتی کفایت اللہ)

(16) کیا مسلمان اپنی مساجد وغیرہ کو غیر مسلم علاقوں میں چھوڑ دیں گے؟ (مسٹر یٰسین نوری)

(17) ہم اسلام کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کریں گے۔ اسلام کی حفاظت پاکستان سے نہیں ہو سکتی۔ مجلس احرار مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پہلے ہی جدوجہد کر رہی ہے۔ اگر کبھی "اسلامستان" کا الگ وجود عمل میں آیا تو وہ مجلس احرار کے ہاتھوں عمل میں آئے گا۔ (مولانا حبیب الرحمٰن)

یعنی مجوزہ "اسلامستان" اس لئے ناقابل قبول ہے کہ یہ لیگ کے ہاتھوں عمل میں آرہا ہے۔ جو اسلامستان مجلس احرار کے ہاتھوں وجود پذیر ہو گا۔ وہ قابل قبول ہو گا!)

(18) اگر ہندوستان کی تقسیم مذاہب کی بنیاد پر کی جاتی ہے تو ان لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ سکھوں کو ایک "سکھ استھان" بنانے سے روک دیں (مفتی محمد نعیم)

(19) مسلمان ایک جداگانہ قوم نہیں ہیں کیونکہ

(الف) اس اسکیم کے مجوزین یقیناً ہندوستانی تھے۔

(ب) ہندوستان کے مسلمان۔ بیرون ہند میں بھی ہندی۔ ہندوستانی یا انڈین کہلاتے ہیں۔

(ج) ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اس ملک کے قدیمی باشندوں کی نسل سے ہے اور اس اعتبار سے دراوڑ اور آرین سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔

(د) تبدیلیٔ مذہب سے تو قومیت نہیں بدل سکتی۔ (خان بہار اللہ بخش)

(ان اقتباسات کے حوالے کے لئے دیکھئے اسٹیٹسمین میں 27 لغایت 2 مئی 1940ء

یہ اعتراضات کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ان میں سے کم و بیش ہر ایک کے متعلق اس سے پیشتر اصلاً یا ضمناً کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان اعتراضات کو ہم نے بالتفصیل اس لئے درج کر دیا ہے کہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ یہ کس قسم کی ذہنیت رکھنے والے حضرات تھے۔ جو اس کانفرنس میں جمع ہوئے اور انہوں نے وہاں سوائے اس کے کہ ہندوؤں کے اعتراضات کو دُہرا دیا اور کیا کیا؟ چار دن تک یہ حضرات ایک قوم۔ ایک قوم کی رٹ لگاتے رہے اور کسی نے نہیں سوچا کہ ایک قوم بننے کے لئے اولین شرط دلی دوستی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم کی یہ آیتِ مقدسہ ان حضرات کے پنڈال کے سامنے سب سے بڑے دروازہ پر جلی حروف میں لکھی ہوئی موجود تھی کہ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ (2/257)۔ کفار کے دوست شیاطین ہوتے ہیں۔

چنانچہ چار روز کے بعد یہ کانفرنس ختم ہوئی اور اس کے فیصلوں پر ہندو مہا سبھا کے صدر جناب ساورکر کی طرف سے تبریک و تہنیت کا تار موصول ہوا (ہندوستان ٹائمز 1940-5-3)

ان کی محنت بر آئی۔ ان کی مساعی مشکور ہوئیں۔ جن کی رضا جوئی کے لئے اس قدر تگ و دو کی گئی تھی انہوں نے اظہار خوشنودی میں مبارکباد کا تار بھیجدیا اور یہ حضرات اس سارٹیفکیٹ کو گلے میں لٹکائے شاداں و فرحاں یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

کانفرنس کی ناکامی ہندوؤں نے یہ سمجھا تھا کہ ادھر یہ کانفرنس ہوئی اور ادھر ایک طرف قصر ابیض (وائٹ ہال) میں زلزلہ آگیا اور دوسری طرف مسلم لیگ کی گردن فرطِ ندامت سے جھک گئی کہ ہیں! ہمارے دعویٰ نمائندگی کا کس طرح پول کھل گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ نہ لندن ہی میں کوئی پتہ کھٹکا اور نہ ہی مسلمانانِ ہند کو ہی احساس ہوا کہ دہلی میں ہوا کیا ہے۔ نہ

برطانوی حلقۂ سیاست میں اس کا کوئی ذکر تک آیا۔ نہ ہی مسلم لیگ نے اس کو در خور اعتنا سمجھا۔ اسی مایوسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ہندو پریس جو اس کانفرنس کے دعویٰ ہمہ گیری کا ڈھول پیٹ رہا تھا اب اس طرح خاموش ہے کہ گویا

وہاں بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

حتیٰ کہ گاندھی جی نے بھی ایک لفظ تک اس کے متعلق نہیں لکھا۔ اس تجربہ کی ناکامی سے جو دھکا ہندوؤں کے قلب پر لگا تھا۔ اس کے صدمہ میں کچھ افاقہ ہوا تو حقیقت زبان پر آہی گئی۔

مسٹر ایم۔ این رائے لکھتے ہیں۔

"ہم "ہندوستانی قومیت" کی تقسیم کی اسکیم کے خلاف مسلمانوں کے افکار کی شیرازہ بندی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہم کانگریسی لیڈروں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسی کانفرنسوں یا مظاہروں کی قوت یا وزن کے اندازہ کرنے میں حد سے نہ بڑھا کریں۔ جتنی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں ان سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ آزاد مسلم کانفرنس کامیاب ضرور رہی لیکن یہ ایک ہلاکت انگیز تحریک ہو گی۔ اگر یہ کوشش کی گئی کہ اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے اور اسے خواہ مخواہ مسلم لیگ کی مدمقابل جماعت سمجھ لیا جائے۔ مسلم لیگ کی قوت اور اس کے ہم خیال طبقہ کی تعداد کو گھٹانے کی کوشش سے کچھ فائدہ نہیں۔ مسلم لیگ آج اس ملک میں مسلمانوں کی بہت بڑی نمائندہ جماعت ہے۔ پاکستان ریزولیشن یا آزاد کانفرنس اس حقیقت کو کبھی بدل نہیں سکتے"۔

(انڈی پنڈنٹ انڈیا۔ 12 مئی 1940ء)

آزاد کانفرنس کے منتظم حضرات اپنی مساعی مشؤمہ کے ان نتائج کو دیکھ کر یقیناً غم و غصہ سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہون گے۔ کہ **خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ** اسے کہتے ہیں۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

لیکن انہیں افسوس کس بات کا۔ روپیہ کسی کا صرف ہوا۔ ان کی چار دن ہوٹلوں میں تفریح ہو گئی۔ باقی رہی حمیتِ ملّی۔ سو اگر وہ پاس ہوتی تو یہ کانفرنس منعقد ہی کیوں ہوتی۔

تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

☆

کچھ اپنوں سے

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مُشتِ پرے داری
بیا من بانو آموزم طریق شاہبازی را

جب انتہائی شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ آسمان شعلہ باری کرتا ہے۔ زمین سے لُو کے بھبکے نکلتے ہیں۔ تو کہیں سے ایک سہانی بدلی نمودار ہوتی ہے۔ جو پژمُردہ انسانوں کو پھر سے نویدِ حیات دیتی ہے۔ مُردہ ولولے جاگ اٹھتے ہیں۔ نگاہوں میں شعاعِ اُمید سے تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا پھر سے جی اٹھتی ہے۔ جب بادِ خزاں ہر باغ و راغ کو اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشہ بنا دیتی ہے۔ تر و تازگی کا کہیں نشان باقی نہیں رہتا۔ نزہت و لطافت گم ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد بہار کا دور آتا ہے۔ شگوفے پھوٹتے ہیں۔ کلیاں مہکتی ہیں۔ غنچے چٹکتے ہیں۔ زندگی ہر شاخ سے تڑپ تڑپ کر باہر آجاتی ہے۔ بشاشت و شگفتگی اُبل اُبل کر

پھوٹتی ہے۔ ہر طرف ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ ہر سمت ایک جہانِ نو کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔

جب رات کی تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ روشنی کا منفذ بند ہو جاتا ہے۔ نُور کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ تو اس کے بعد خاورِ مشرق اپنی پوری شانِ جہاں تابی سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ اندھیرا گم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف نُور کی چادر بچھ جاتی ہے۔ ذرہ ذرہ کروٹ بدلتا ہے۔ حیاتِ تازہ انگڑائیاں لیتی ہے۔ نظامِ کہن کی بساط اُلٹ جاتی ہے اور ایک نیا دَور شروع ہو جاتا ہے۔

یہ فطرت کے اٹل قوانین ہیں۔ یہ نظامِ کائنات کے غیر متبدل ضوابط ہیں۔ ان سے کسی کو مفر نہیں کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

لیکن جب یہ قوانینِ فطرت۔ کائنات کی ہر شے کو محیط ہیں۔ تو کیا انسان۔ جو چاروں طرف سے ضوابطِ فطرت کی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ ان سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں! یہ بھی ان سے مستثنیٰ نہیں۔ قوموں کی زندگیاں بھی انہی قوانین و ضوابط کے تابع ہوتی ہیں۔ جب کوئی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ وہ نکبت و ادبار کے گرداب میں پھنس جاتی ہے تو اس پر افسردگی اور پژمُردگی چھا جاتی ہے۔ مایوسیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور اُمید کی کوئی جھلک کہیں سے نظر نہیں پڑتی۔ لیکن اس انحطاط و تنزل کے بعد ان کے اندر پھر سے زندگی کی تڑپ نمودار ہوتی ہے اور وہ ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور لٹی ہوئی دولت کی وارث بن جاتی ہے۔ لیکن جس طرح قطراتِ بارش سے دوبارہ زندگی اسی زمین کو مل سکتی ہے۔ جس میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت باقی ہو۔ بادِ بہاری سے وُہی شاخِ گل پیرہن ہو سکتی ہے جو اپنی اصل سے کٹ کر الگ نہ ہو چکی ہو۔ نورِ سحر سے وہی آنکھ فیضیاب ہو سکتی ہے جس کی بینائی باقی ہو۔ اس طرح دوبارہ زندگی بھی وہی قومیں حاصل کر سکتی ہیں جن میں زندہ رہنے کی تمنا ہو اور ان کا رشتہ اپنے اصل سے منقطع نہ ہو چکا ہو۔ ہندوستان کے مسلمان ایک مدت سے افسردگی و پژمُردگی۔ خستگی و بدحالی۔ نکبت و افلاس کے جہانِ نامساعد میں سسکیاں لے رہے تھے۔ نہ ان کے سینوں میں دل باقی تھے۔ نہ دل میں کوئی ولولہ۔ نہ رگوں میں خون باقی تھا نہ خون میں حرارت۔ نہ زندگی کا کوئی نصب العین سامنے تھا نہ اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ زندگی ان کے نزدیک محض نفس شماری کا نام تھا اور دنیا سزا بھگتنے کا جیل خانہ۔ اس دوران میں کئی ایک چارہ ساز اٹھے اور مقدور بھر ان کے درد کا درمان سوچا۔ ان کی نیتیں نیک اور کوششیں مخلص تھیں۔ لیکن چونکہ مرض کہنہ اور پیچیدہ تھا۔ اس لئے کوئی صحیح علاج نہ ہو سکا۔ جب یہ درد بڑھ کر اس انتہائی نقطہ تک جا پہنچا جہاں سے قاعدۂ فطرت کے ماتحت ردِّ عمل شروع ہوتا ہے۔ تو قدرت نے اپنی گرم گُستری سے ان کے اندر ایک ایسا مردِ مومن پیدا کر دیا جس نے ان کے مرض کی صحیح صحیح تشخیص بھی کی اور اس کا علاج بھی سوچا۔

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا زبزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے بہت جلد محسوس کر لیا کہ مسلمان کی تمام مصائب و نوائب کا راز اس میں ہے کہ یہ اپنے مقام کو بھول چکا ہے۔ اپنے آپ کو فراموش کر چکا ہے۔ چنانچہ اس مسیحائے اُمّت نے اپنی تمام عمر اس جہاد میں صرف کر دی کہ وہ مسلمان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کر دے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام کو شروع سے آخیر تک دیکھ جائے۔ ہر جگہ اسی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ مسلمان کا صحیح مقام کیا ہے! وہ اس سے کہتے ہیں کہ۔

بے خبر تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وہ اسے بتاتے ہیں کہ

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

جب انسان اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اس میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اب اس مقام پر اسے اپنے صحیح نصب العین کی تلاش ہوتی ہے اور وہ اسی تلاش میں تشنہ لب۔ مستانہ وار۔ اِدھر اُدھر دوڑتا ہے یہی زندگی کی علامت ہے۔ بلکہ عین زندگی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است — کارِ دانش را دراز مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہاں رنگ و بُواست — فطرت ہر شے امین آرزو است
آرزو را در دل خود زندہ دار — تانگر دو مشت خاک تو غبار

انہوں نے مسلسل تدبر و تفکر کے بعد مسلمان کے لئے ایک مکمل نصاب مرتب کر دیا جس کے اتباع سے وہ موجودہ پستی سے ابھر کر اپنے صحیح مقام کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ (یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم نے اس نصاب کی طرف پوری پوری توجہ نہیں دی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ابھی تک یوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ یہ نصاب قرآنِ کریم کی ہی تفسیر و تشریح ہے اور جب تک ہم قرآن کی طرف نہیں لوٹتے ہماری کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی) انہوں نے جب یوں زمین تیار کر لی تو اس کے بعد وہ مقام آیا جہاں پہنچ کر انہوں نے قوم کے لئے نصب العین مقرر کرنا تھا۔ جہاں ان کے مدعا کا تعین کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے 1930ء میں اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقتِ ثابتہ کو قوم کے سامنے رکھ دیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمانوں کو حکومت الٰہیہ کی بنیاد رکھنی چاہئے اور اپنے تمام ذرائع و اسباب کو اس مقام پر مرکوز کر کے اپنے اندر وہ قوت پیدا کر لینی چاہئے جس سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو سکے۔ یہ تھا وہ درخشندہ نصب العین جو انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ بلکہ اسی اصول کی عملی تشریح تھی۔ جس کی طرف وہ اس وقت سے بہت پہلے اشارہ کر چکے تھے۔ جب فرمایا تھا کہ

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — بامزاج اُو بسازد روزگار
گرنہ سازد بامزاج اُو جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیاد موجودات را — می دہد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برہم زند — چرخ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار

یہی "جہانِ نو" تھا جس کی تشریح انہوں نے 1930ء میں الٰہ آباد کے مقام پر کی تھی۔ "شاعرِ فردا" کی یہ آواز شاید قبل از وقت سمجھی گئی۔ اس لئے اس پر وہ توجہ نہ دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ قوم دس برس تک مصروفِ دشت نوردی و بادہ پیمائی رہی اور اس کے بعد مارچ 1940ء میں۔ اسی مردِ قلندر کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر لفظاً لفظاً وہی کہا جو اس نے دس سال

(اسرار و رموز)

پیشتر الٰہ آباد میں کہا تھا۔ یہ ہے لیگ کا ریزولیشن جو ہمارا محل موضوع ہے یہ نصب العین متعین ہونے کے بعد اس کے حصول کی جدوجہد ایسی ہی ہے جیسی ٹکٹ خرید لینے کے بعد گاڑی میں سوار ہونے کی تگ و دو۔ ورنہ اگر آپ ٹکٹ خرید کر آرام سے وہیں بیٹھے رہیں۔ تو منزلِ مقصود تک قیامت تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس تگ و دو میں سب سے پہلا اور سب سے اہم بنیادی مرحلہ ہے اس نصب العین پر یقین۔ ایسا محکم یقین جو ایمان کا درجہ لئے ہوئے ہو۔ ایسا غیر متزلزل ایمان جس کی کیفیت عشق تک جا پہنچی ہو۔ اگر آپ میں یہ یقین موجود ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس نصب العین کے حصول سے روک نہیں سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الا میں پیدا

یاد رکھئے۔ قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ان کے یقین کے استحکام کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ یقین اور ایک صحیح نصب العین کی صداقت کا یقین۔ ایمان اور قرآن کریم کی روشنی میں متعین کردہ مدعا کا ایمان۔ آپ سمجھ نہیں سکتے کہ اس سے قوموں میں کس قدر بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کس درجہ کوہ شکن ہمت اور فلک پیما عزم پیدا ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ (۴۱/۳۰)

یہ **ثم استقاموا** کیا ہے۔ وہی جسے ایمانِ محکم کہا گیا ہے۔ وہی جو حصولِ نصب العین کا ناقابلِ شکست ارادہ ہے۔ وہی جسے انگریزی میں ریزولیشن (Resolution) کہتے ہیں اگر آپ اس کے صحیح معنی سمجھ لیں تو پھر فی الواقعہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس کے حصول سے روک نہیں سکتی۔ اور تو اور خود گاندھی جی، جو اسکیم کے اس قدر شدید مخالف ہیں، وہ بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ

> "اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان فی الواقعہ اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس خطۂ ارض پر کوئی ایسی قوت نہیں جو انہیں اس سے باز رکھ سکے۔ خواہ اس کی کتنی ہی تشدد آمیز یا عدم تشدد کے انداز کی مخالفت کیوں نہ ہو۔
>
> (ہندوستان ٹائمز 1940-5-5)

سوال صرف اتنا ہے کہ "آپ ایسا چاہتے ہیں یا نہیں" اگر آپ "چاہتے ہیں" تو پھر یہ ہو کر رہیگا اور

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں

یاد رکھئے! اگر یہ اسکیم (خدا نکردہ) ناکام رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہو گی کہ ہندوؤں نے اس کی اس درجہ مخالفت کی تھی۔ انگریز اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خود مسلمانوں میں سے ایک جماعت ہندو کی ہم نوائی میں اس کے خلاف یورش کر کے اُمنڈ آئی تھی۔ اس ہجوم مخالفت سے یہ کبھی ناکام نہیں رہ سکے گی۔ وہ کون سا وقت تھا کہ حق کی مخالفت نہیں ہوئی؟ وہ کونسا زمانہ تھا کہ باطل اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے حق کے خلاف یلغار کر کے نہیں آتا رہا؟ یہ خیر و شر کی جنگ شروع سے چلی آرہی ہے۔ اس لئے یہ کشمکش اس اسکیم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر یہ ناکام ہوئی تو اس لئے ہو گی کہ اپنے نصب العین کی صداقت پر آپ کا یقین، یقینِ محکم نہ تھا۔ آپ کا عہد، عہدِ استوار نہ تھا۔ آپ کا عشق، عشقِ صادق نہ تھا۔ ورنہ یہ مخالف اور مخالفوں کی قوتیں! ایمان کے سامنے ان کی حقیقت کیا ہے! ایمان والوں کی تو حالت یہ ہوتی ہے کہ

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○ (۳/۱۷۳)

جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مخالفین تو ایک ہجوم پیدا کر رہے ہیں۔ اس لئے ان سے ڈرو۔ تو اس اطلاع سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ (یہ ہجوم اکٹھے ہوتے ہیں تو ہونے دو) ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ اور وہ بہترین سازگار ہے۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ○ ۳/۱۷۴

پس وہ اللہ کے فضل و نعماء سے (جھولیاں بھر بھر کر) واپس لوٹے اور انہیں کسی قسم کی کوئی گزند نہ پہنچ سکی (اس لئے کہ) انہوں نے اللہ کی رضا جوئی اختیار کی تھی اور اللہ بہت بڑے عظیم الشان فضل (وکرم) کا مالک ہے۔

مومن کو مخالفین کی یورش و یلغار سے کیا خوف۔ فرمایا کہ

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

یہ تو شیطان ہے جو (اپنے دوستوں سے) تمہیں ڈراتا ہے سو ان سے مت ڈرو۔ صرف مجھ ہی سے ڈرو۔ اگر تم صاحب ایمان ہو تو۔

اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ "شیطان کے دوست" کون ہیں جن سے شیطان ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح میں فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيَآئُهُمُ الطَّاغُوْتُ (2/257)۔ کفار کے دوست شیطانین ہیں یعنی کفار اور ان کی دوستی کا دم بھرنے والے سب ایک ابلیسی سازش کے ماتحت شور مچاتے رہتے ہیں کہ کسی طرح اس سے مسلمانوں کو مرعوب کر دیں اور ان کے دل پر خوف طاری ہو جائے۔ لیکن قرآن کریم نے مومن کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے وقت میں اس کا ایمان اور بڑھ جائے اور اس کا عزم اور راسخ ہو جائے۔ اپنے نصب العین کی صداقت واضح ہو کر اس کے سامنے آجائے۔ اپنے خدا پر بھروسہ اور قوی ہو جائے۔ مخالفت کے اس تمام سازو سامان کو دیکھے اور انہیں استہزاء کی ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ دیکھتا ہوا مستانہ وار آگے بڑھ جائے۔ اس کا بھروسہ تو اپنے خدا پر ہوتا ہے اور خدا پر بھروسہ ہی وہ قوت ہے کہ جو اس کے ہاتھوں کی "کھجور کی ٹہنیوں" میں شمشیر جگر دار کے جوہر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک مومن اور کافر میں یہی تو فرق ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

☆

یوں تو دنیا میں ہر زمانہ میں تغیرات ہوتے چلے آئے ہیں لیکن جس برق رفتاری کے ساتھ دور حاضرہ میں تغیرات رونما ہو رہے ہیں اس سے پیشتر اس کی نظیر بمشکل مل سکے گی۔ آج تو صبح اور شام میں قوموں کی تاریخ بدل جاتی ہے۔ زمین کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔ اس عظیم الشان انقلاب کے زمانہ میں ہر وہ قوم جو اپنے مستقبل سے ذرا بھی غافل ہوئی۔ پیس کر رکھدی جائیگی۔ جو ذرا بھی کمزور ہوئی۔ کچل دی جائیگی۔ یہ اصول فطرت ہے۔ یہ قاعدۂ روزگار ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور بصیرت سے نوازا ہے۔ وہ صاف صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کس قسم کے انقلابات کی

آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر مسلمان اس کشمکش میں اپنی زندگی چاہتا ہے تو اسے "فولاد" بن کر جینا ہو گا اور اس کی عملی شکل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمام مسلمان ایک مرکز کے ساتھ وابستہ ہو کر رہیں اور وہ اپنے اندر ہم آہنگی اور یک رنگی کے جوہر پیدا کریں۔ اپنے عسکری نظام کو پھر سے زندہ کریں اور یوں ایک "بُنیانِ مرصوص" بن کر دنیا کی ہر مخالفت کا مقابلہ کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی حکومت کے قیام کا جو نصب العین ان کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر کٹ مرنے کا عزم پیدا کریں اور یوں بساطِ سیاست کے اس نظامِ کہن کو اُلٹ کر ایک جدید نظام کی طرح ڈالیں۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جب سیمرغ اپنے والہانہ جذبات میں مست ہو جاتا ہے تو خس و خاشاک کو اپنے گرد جمع کر کے این و آن سے بے خبر آنکھیں بند کر کے اس ڈھیر کے اندر بیٹھ جاتا ہے۔ عشق کے دیپک کی شعلہ ریز موسیقی اس کے رگ و پے سے نکل کر اس کے گرد وپیش کی کائنات کو پھونک دیتی ہے اور یہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ لیکن اس راکھ کے ڈھیر سے پھر ایک نیا سیمرغ پیدا ہوتا ہے جس کی رگوں میں خونِ شباب اور جس کے بازوؤں میں قوتِ شاہین موجزن ہوتی ہے۔ یہی حالت قوموں کی موت و زیست کی بھی ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

☆

یہ جہانِ نو تعمیر ہو کر رہے گا۔ یہ دنیائے جدید بن کر رہے گی۔ یہ زمانے کے مقدرات ہیں۔ یہ فطرت کے اٹل قاعدے ہیں۔ اگر بقول حضرت علامہؒ مسلمانوں نے اس کی قیمت جلد پیش کر دی تو یہ جلدی وجود میں آجائے گا اور اگر کوتاہی کی تو اس میں دیر لگ جائے گی۔ لیکن صرف دیر ہی ہو گی۔ عمل میں یہ آکر رہے گی کہ اللہ نے مسلمانوں سے اقوام زمین ایشیا کی پاسبانی کا کام لینا ہے۔ ان سے دنیا کی امامت کا فریضہ سرانجام دلانا ہے۔ اس لئے اس کی حکمت و رحمت سے بعید نظر آتا ہے کہ وہ نو کروڑ کی اس جمیعت کو یوں ورطۂ کفر میں ڈوب جانے دے۔ لیکن سوال یہ نہیں کہ مشیتِ خداوندی کیا ہے سوال تو یہ ہے کہ اس مشیت کی تکمیل کے لئے تم کیا کرتے ہو۔ ظہور و تمکنِ اسلام خدا کا لکھا ہوا نوشتہ تھا جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل بدر و حنین کے ان زندہ جاوید قدوسیوں کے ہاتھوں ہوئی جن کا مقدس خون شجرِ اسلام کی ہر شاخ کی نمی کا باعث ہے۔ آج اسلام کا شجرِ طیب پھر اسی نمی کا محتاج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت ازلی کس کے حصے میں آتی ہے۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
اب کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

مبارک ہیں وہ جو اپنے خدائے قدوس کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے سربکف و کفن بدوش میدان میں آجائیں کہ اسلام پنڈالوں کے اندر زندہ نہیں ہوتا میدانوں میں زندہ ہوتا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل! "نہ جل ترنگ"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر دراز

مملکتوں کے بقاو فروغ کا ابدی اصول

اگست 1991ء کے شمارہ طلوع اسلام میں، ہم نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت تحریر کیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ نے بعثتِ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت یہ بتائی ہے کہ:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7/157)

اور وہ ان بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے نوع انسانی دبی چلی آرہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔

اور آپؐ کی نبوت پر ایمان لانے اور آپؐ کی تعلیم کے مطابق اعمال صالحہ سے کیا ملے گا؟

استخلاف فی الارض یعنی۔ سرفرازی و حکمرانی!

یہ خدائے خلیل کے اس وعدہ کی تفسیر ہے کہ:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (24/55)

اور امن و سکون اور خوشحالی!

وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا" (24/55)

اس قسم کا امن و سکون اور اس قسم کی بے خوفی کا عالم، کہ آپؐ نے فرمایا کہ "میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں ایک عورت تن تنہا، یمن سے چلے گی اور صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا" اور آپ نے ایسا کر کے دکھا دیا۔

اس قسم کا خوف و حزن سے پاک ماحول اور بنیادی ضروریاتِ زندگی کی اس قسم کی فراوانی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ:

"جس بستی میں کسی ایک شخص نے صبح یوں کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ کی حفاظت کا ذمہ اٹھ گیا۔ (مسند امام احمد)

حضورؐ کے اسی ارشاد کے پیشِ نظر، سربراہِ مملکت اسلامی کی ذمہ داری کا یہ احساس تھا جسے حضرت عمرؓ

نے ان الفاظ میں دہرایا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6)

اس روئے زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس لئے:

اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم! عمر سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔

(شاہکار رسالت ایڈیشن 1991ء صفحہ 365)

جب اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق نظامِ مملکت (الدین) کا قیام عمل میں آتا ہے تو اس کے ثمرات سے جو جنت وجود میں آتی ہے' اسے دیکھ کر دنیا کی ہر قوم اس نظام کے لئے چشم براہ ہو جاتی ہے اور اسلامی مملکت کی سرحدیں پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں اسلامی مملکت کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا اور اس کے بعد خلفائے راشدین بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں اس کی سرحدیں بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گئی تھیں۔ یہ ہے اصول' مملکت کی بقاء اور فروغ کا۔ یعنی:

اندرونی خوشحالی اور امن و سکون سے مملکت کی سرحدیں باہر کی طرف پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی جاتی ہیں جبکہ مملکت کی حدود میں امن و سکون کے فقدان اور حفاظتِ جان و مال کی طرف سے عدم اطمینان اور معاشی بدحالی سے اس کی سرحدیں اندر کی طرف سکڑتی ہیں اور بالآخر اس کا نام و نشان تک دنیا کے نقشہ پر قائم نہیں رہتا۔

اور یاد رکھئے ! امن و سکون اور معاشی خوشحالی ممکن نہیں اس نظام کے بغیر' جس کے متعلق خالقِ کائنات نے فرمایا ہے کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ○

(5/3)

یعنی قرآن کا عطا فرمودہ نظام مملکت"۔

کاش ہماری اس دردمندانہ پکار پر کوئی صاحبِ اقتدار توجہ دیتا اور صورتِ احوال کی درستگی کے لئے صحیح سمت میں کوئی قدم اٹھاتا لیکن ایسا نہ ہوا اور آج ہم' قومی سطح پر جس معاشی بدحالی اور فقدانِ امن و سکون اور حفاظت جان و مال کی طرف سے بے چارگی کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں اور ان حالات سے نکلنے کی کوئی راہ ہمیں نظر نہیں آتی' وہ 1991ء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خوفناک اور کہیں زیادہ خطرناک ہے اور یہ ہم پر کہیں خارج سے آکر نافذ نہیں ہوئی' ہمارے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہے۔

غور فرمایئے کہ اس وقت ہم نے یہ کہا تھا کہ مملکتوں کی بقاء اور فروغ کا ابدی اصول یہ ہے کہ اندرونی خوشحالی اور امن و سکون سے مملکت کی سرحدیں باہر کی طرف پھیلتی اور وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہیں جبکہ مملکت کی حدود میں امن و سکون کے فقدان اور حفاظت جان و مال کی طرف سے عدم اطمینان اور معاشی بدحالی سے اس کی سرحدیں اندر کی طرف سکڑتی اور آخر الامر ناپید ہو جاتی ہیں اور اس طرح ایسی مملکت کا نام و نشان تک دنیا کے نقشہ سے مٹ جاتا ہے۔

اس وقت سے لے کر آج تک جس سرعت اور حجم سے مملکت پاکستان میں امن و سکون کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں اور کراچی میں بالخصوص اور مملکت کے باقی حصوں میں بالعموم جس طرح عوام کے جان و مال کو بے قدر و قیمت کیا گیا ہے اور جس کے نتیجہ میں کراچی کو مملکت پاکستان سے الگ کرنے کی جن گھناؤنی سازشوں کے خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے' اس کے بعد ہم کس انتظار میں ہیں جو یوں حالات کو بے قابو ہونے کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔

کیا فی الواقعہ ہماری قوم سوچ سمجھ سے عاری اور فکر و عمل سے بانجھ ہو گئی ہے' جو اصلاح احوال کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو پا رہی۔

یہ ہے فکر مند ہونے والی اصل بات ! یعنی اصلاح احوال کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو پا رہی کہیں ایسا تو نہیں کہ اصلاح احوال کے نام پر کی جانے والی کوششوں کی سمت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47/7)

اگر تمہاری کوششیں اللہ (کے اس قانون) کی مدد کریں گی (جو اس نے انسانیت کی برومندی کے لئے کائنات میں رائج کر رکھا ہے) تو اللہ (کا یہ قانون) تمہاری مدد کرے گا۔

اور جب اللہ (کا قانون) تمہاری مدد کرے گا

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۔۔۔ (3/160)

تو کوئی دوسرا تمہارا راستہ نہیں روک سکے گا۔

تو بات یہ ہوئی کہ ہماری اصلاح احوال کی کوششوں کا اللہ کے اس آفاقی قانون سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے جو تمام کائنات میں انسانیت کی برومندی کے لئے جاری و ساری ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ بھی کیا جائے گا اس کا نتیجہ ناکامی' نامرادی اور رُو سیاہی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

اللہ کے اس آفاقی قانون کی بنیادی قدر یہ ہے کہ ہر فردِ مملکت کو انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم مانا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17/70)

نہ صرف یہ کہ انسان کا واجب التکریم ہونا تسلیم کیا جائے بلکہ انسانی معاشرہ میں ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں ہر بنی آدم کو یہ تکریم فی الواقع حاصل ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو معاشرے کو سنوارنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اگر ہماری کوششیں' اللہ کے اس آفاقی قانون کے خلاف ہوں گی تو ظاہر ہے کہ پھر اللہ تو ہمارا ساتھ نہیں دے گا اور جب اللہ کا ساتھ چھوٹ جائے تو:

وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (3/160)

اگر اللہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے بعد دنیا میں کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے؟

جس قوم کا ساتھ اللہ (کا قانون) چھوڑ دے (بمقابلہ **ینصر**) اور وہ اس طرح باقی اقوام سے پیچھے رہ جائے تو اس کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرح پیچھے رہ جانے والا (خواہ ایک فرد' دوسرے افراد سے پیچھے رہ جائے' اور خواہ ایک قوم' دوسری اقوام سے پیچھے رہ جائے) زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ (17/22)

ہمارے ہاں اللہ کے قانون کی اس بنیادی قدر' تکریم آدمیت' کی جس قدر مٹی پلید کی جا رہی ہے' اس پر ہر قلبِ حسّاس کی آنکھ اشک بار ہے۔ یہاں تکریم آدمیت کے نام کی کوئی چیز نہیں۔ مئی 1995ء کے شمارہ طلوع اسلام کے لمعات کو ایک بار پھر سامنے لائیے اور غور کیجئے کہ ہمیں اپنی "مملکتِ خداداد" میں یہ گراں مایہ قدر کہیں نظر آتی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ صدرِ مملکت نے ایک آرڈی نینس کے ذریعہ' پولیس کے رُوبرُو (اس کے جسمانی اور ذہنی تشدد کے خوف سے) اقبالی بیان کو قانونی حیثیت دے دی ہے۔ اس آرڈی نینس کے خلاف حزبِ اقتدار کے سوا' ہر فردِ مملکت صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے۔ ماہرین قانون اسے انتہائی خطرناک اقدام قرار دے رہے ہیں لیکن حکومت کے کان پر جوں تک رینگتی نظر نہیں آتی۔ شاید حزبِ اقتدار کو یہ زعمِ باطل ہے کہ اقتدار ہمیشہ اس کی لونڈی بنا رہے گا اور اس قانون کا اطلاق ان کے اپنے اوپر کبھی نہیں ہو گا۔ اس لئے ان کے مخالفین اور عامتہ الناس کی اگر کھال ادھڑتی ہے تو کیا ہوا۔ شاید اس قانون سے یہی ان کا مقصود و مطلوب بھی ہو۔ لیکن ہم یہاں عربی زبان کا ایک ایسا کلاسک قول ان کے سامنے لاتے ہیں' جسے درحقیقت سنہری الفاظ میں لکھ کر ہر صاحبِ اقتدار کے سامنے ہمیشہ آویزاں رہنا چاہئے۔ شاید اس سے ہماری حزبِ اقتدار اور ساتھ ہی ساتھ حزبِ اختلاف کی آنکھیں کھل سکیں۔ سنئے وہ کلاسک قول یہ ہے کہ

لودامت لغیرک ما اتصلت بک

"اگر (کرسئ اقتدار کو) دوسرے لوگ ہمیشہ ہمیشہ اپنے پاس رکھ سکتے' تو یہ تم تک کبھی نہ پہنچ پاتی"۔

یعنی یہ حقیقت کہ آج تم اس کرسئ اقتدار پر فائز ہو' اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ تم سے پہلے اس کرسی پر بیٹھنے والے' اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھنے کا انتظام نہ کر سکے۔ لہٰذا تمہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ تم بھی' اس کرسی کی دائمی روایت کے مطابق' اس پر ہمیشہ قابض نہیں رہ سکو گے!

ہم بات کر رہے تھے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ' تکریم آدمیت کی بنیادی قدر کی۔ جب تک اللہ کے آفاقی قانون کی یہ قدر ہمارے معاشرہ میں قائم نہیں کی جاتی اور ہر فرد معاشرہ اس سے بہرہ ور نہیں ہو جاتا' اصلاح احوال کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد انسانی جان کی حرمت و تکریم کی قدر آتی ہے۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانی جان اتنی اہم ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایک جان بھی ناحق ضائع کر دی تو گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کر دیا (5/32) اس کے برعکس اگر کسی شخص نے کسی ایک انسانی جان کو بھی بچا لیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو زندگی دے دی (5/32)

اب اپنے ہاں نظر دوڑائے اور دیکھئے کہ بے گناہ انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے کس طرح اس ملک میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا' جب یہاں متعدد شہری جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھتے ہوں۔ یہ بھی اللہ کے اس آفاقی قانون کی خلاف ورزی ہے جس نے انسانی جان کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس کے نزدیک ایک جان لینے والا پوری انسانیت کا قاتل گردانا جاتا ہے اور اسی ایک جان کو بچانے والے کا مقام اس قدر بلند مانا گیا ہے کہ گویا اس نے پوری بنی نوع انسان کو زندگی بخش دی ہو۔

اللہ کے قانون کی اس کھلم کھلا اور بے دریغ خلاف ورزی ہی نہیں' استہزاء کی' جو سزا ہمیں اس وقت مل رہی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت ہی آئے گی۔

حکومت کا کام' محسنِ انسانیت' حضور نبی اکرمؐ کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ

"میں ایسا نظام قائم کروں گا کہ اس میں ایک عورت یمن سے چلے گی اور تن تنہا صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا"۔

یہ ہے بنیادی فریضہ حکومت کا! افراد مملکت کو ایسا ماحول فراہم کرنا جس میں کسی کی جان و مال کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ اگر ایسا ماحول قائم نہ کیا جائے (یا نہ کیا جا سکے) تو کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کا مشاہدہ تو ہم ہر روز کر رہے ہیں۔

حکومت کے ان دعووں کا کہ ملک میں امن و امان کا کوئی مسئلہ نہیں' خود یہ دعوے ہی مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں جب ہماری حکومت اغیار سے یہ اپیلیں کرتی نظر آتی ہے کہ آؤ اور دہشت گردوں سے نپٹنے کے لئے ہماری مدد کرو۔

یاد رکھئے جب اللہ (کا قانون) کسی کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو کوئی دوسرا اس کا مددگار نہیں بن سکتا (3/160)

اگر واقعی کسی کے دل میں پاکستان کا درد ہے اور وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہے تو کرنے کا کام یہی ہے کہ اس مملکت میں ایسا نظام نافذ کر دیا جائے جو اللہ کے اس آفاقی قانون کی تائید و نصرت میں ہو جو اس نے تمام کائنات میں انسانیت کی برومندی کے لئے قائم کر رکھا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اللہ کی کائناتی قوتیں تمہاری مدد کریں گی اور جب ایسا ہو گا تو

اِذَا جَآءَ نَصْرُاللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ

تو تمہارے لئے کامیابیوں اور کامرانیوں کے تمام راستے کھل جائیں گے۔

اس کے بعد اگلا پروگرام یہ ہو گا کہ

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

تمہیں اللہ کے نظامِ ربوبیت کی نفع بخشیوں کو وسیع تر کرنے کے لئے' پہلے سے بھی زیادہ جدّوجُہد کرنا ہو گی اور اس طرح خالقِ کائنات کو سزاوارِ حمد و ستائش ثابت کرتے رہنا ہو گا اور

وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ

(اور ہمیشہ یہ دیکھنا ہو گا کہ تمہارا کوئی قدم اللہ کے اس آفاقی اور ہمہ گیر قانون کے خلاف نہ اُٹھنے پائے اور (اس طرح) تمہیں ہمیشہ اس کی حفاظت میسر رہے۔

یاد رکھو کہ

اِنَّهٗ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

جب کوئی شخص یا قوم اپنی غلط روشِ زندگی کو چھوڑ کر اس کے قانون کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کے اٹھنے والے ہر ایک قدم کے مقابلہ میں اللہ کا قانون' دو قدم آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہے اور اسے سامانِ پرورش مہیا کرتا ہے۔

ہم نے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک' کتنی ہی حکومتوں اور کتنے ہی نظاموں کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ ہمارے حصہ میں سیاہ بختی اور روز افزوں معاشی بدحالی اور باہمی تشتت وانتشار کے سوا کچھ نہیں آیا۔ پس ہے کوئی جو اس مملکت میں خالص قرآن کریم کا عطا کردہ وہ نظام نافذ کر دے جس میں انسان کی شرف و مجد کا

راز مضمر ہے (21/10) اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (5/3)

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین (نظام حیات) کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے "اسلام" کو بطور ضابطۂ زندگی (دین) تجویز کر دیا ہے اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (3/85)

جو کوئی (فرد یا قوم) بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی مقام نہیں ہو گا اور آخر الامر اس کا شمار ان بدنصیبوں میں ہو گا جو ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔

کیا تم میں کوئی ایک رجلِ رشید بھی ہے؟ (11/78) جو ایسا کر دکھائے اور اس مملکت کو اور افرادِ مملکت کو وہ کچھ بنا دے جو کچھ بنانے کے لئے بانیانِ پاکستان نے اپنے خون کے نذرانے دے کر اسے حاصل کیا تھا۔ ہمارے مخاطب صرف صاحبانِ اقتدار ہی نہیں، حزبِ اختلاف کے سیاستدان بھی ہیں اور ساتھ ساتھ وہ عامتہ الناس بھی ہیں جو اس مملکت میں قانون سازی کے لئے اراکینِ پارلیمان منتخب کرتے ہیں اور انہیں ایوان ہائے اقتدار میں بھیج کر ان کے احتساب سے یکسر غافل ہو کر انہیں من مانیاں کرنے کی کھلی چھٹی دے کر خود خواب خرگوش میں محو ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تباہی آتی ہے تو صرف وہ ہی نہیں ڈوبتے جن کی بداعمالیوں کا یہ نتیجہ ہوتی ہے بلکہ یہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے (8/25)

یاد رکھئے اللہ عزّوجل نے یہ کہہ رکھا ہے کہ

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ○ (42/47)

اپنے رب کی اس دعوت پر لبیک کہو (اس کے احکام و قوانین کی اطاعت اختیار کرو) قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے وہ انقلاب آجائے جو آکر واپس نہیں جایا کرتا۔ اس وقت نہ تو تمہیں کہیں پناہ مل سکے گی اور نہ ہی تم اپنے جرائم سے انکار کر کے بچ سکو گے۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (59/2)

آنکھوں والو، عبرت حاصل کرو!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضروری وضاحت

مسلمان جب جانتا تھا کہ جماعت اور اسلام کا کیا تعلق ہے تو اس کا اپنی جماعت سے الگ ہو جانا تو درکنار اگر کبھی کسی جرم کی پاداش میں کچھ وقت کے لئے جماعت اسے الگ کر دیتی تو اسے محسوس ہوتا کہ اس پر مصائب و آلام کی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ خدا کی یہ وسیع و عریض زمین اس پر تنگ ہو جاتی۔ دنیا اس کی نظروں میں اندھیر ہو جاتی۔ زندگی دوبھر ہو جاتی۔ جینا محال ہو جاتا۔ حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب انہیں ایک کوتاہی کی بنا پر جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا تو چند روز میں ان کی کیا حالت ہو گئی۔ یہ وہ مسلمان تھے جنہیں معلوم تھا کہ جماعت سے علیحدگی ایک مسلمان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔

تحریکوں کی زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی نظر آتے ہیں کہ وہ تحریک میں ہوتے ہیں تو اس لئے کہ اس کے اندر ان کی کوئی اپنی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ ساتھ رہتے ہیں تو اس وقت تک جب تمام معاملات ان کی مرضی کے مطابق طے پاتے ہیں۔ لیکن جونہی کوئی فیصلہ ان کی منشاء کے خلاف ہوا وہ جھٹ جماعت سے الگ ہو گئے۔ یا ایسی حرکتیں کرنے لگے کہ ان سے رستگاری حاصل کرنا ناگزیر ہو گیا۔ یہ وہ دوست ہیں جو تحریک کے ساتھ تھے تو انہیں تحریک میں کوئی عیب نظر نہ آتا تھا۔ جونہی تحریک سے الگ ہوئے تحریک کے خلاف زہر اگلنے یا کارکنان تحریک کی کردار کشی پر کمر بستہ ہو گئے۔ دفتر میں رہتے ہوئے وابستگان تحریک اور قارئین طلوع اسلام کے ایڈریس ان کے پاس موجود ہیں' خط لکھنے میں انہیں دشواری نہیں' قلم پر پابندی نہیں' نہ شرافت' نہ دیانت' نہ خوف خدا' جو دل میں آیا لکھدیا' جو زبان پر آیا کہہ دیا۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جنہیں وہ لکھ رہے ہیں وہ تحریک میں نہ تو ان کی طرح نووارد ہیں نہ تحریک کے اور کارکنان تحریک سے ناواقف کہ وہ ان کی دروغ گوئی سے کوئی اثر قبول کریں۔ ان حضرات کا لکھا ہوا' ایک ایک پرزہ واپس ادارہ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کرمفرماؤں کے حق میں ہم صرف دعائے خیر ہی کر سکتے ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام

ڈان ماڈل سکول

ضروری وضاحت

مارچ 1995ء کے شمارہ میں ڈان ماڈل سکول کے حوالہ سے بتایا گیا تھا کہ سکول کی عمارت تعمیر کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس سے مراد تعمیر کے ابتدائی مراحل از قسم ڈیزائنگ اور نقشوں کی تیاری تھی جو اب آخری مراحل میں ہیں اور کھدائی کا کام انشاء اللہ جلد شروع کر دیا جائے گا۔

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر سید عبدالودود

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ماہنامہ 'طلوع اسلام' کے مضمون نگار جناب ابو منیب راشد کا پیش کردہ آیت (15:26-27) کا مفہوم' مزید تشریح کا متقاضی ہے۔ قارئین کرام کے علم میں ہو گا کہ مارچ 1993ء کے شمارے میں ایک مضمون میں نے بعنوان "ملائکہ" پیش کیا تھا' جس میں آیات (15:26-27) کے معانی بھی درج تھے۔ لیکن چونکہ یہ مضمون انگریزی میں تھا اس لئے گمان ہے کہ بیشتر قارئین اس کی طرف توجہ نہیں فرما سکے ہونگے۔ ان حالات میں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آیت (15:26-27) کا مفہوم پھر سے بیان کردوں۔ اصل موضوع کی طرف لوٹنے سے پیشتر واضح کر دوں کہ ابو منیب راشد صاحب نے اپریل 95ء کے شمارے میں جو کچھ "جنات اور قرآن کریم" کے عنوان کے تحت لکھا ہے' وہ درست ہے۔ آپ نے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ آیت (72:1), (40:29) اور کئی دیگر مقامات پر جہاں جن کا لفظ آیا ہے اس کے معنی چھپے ہوئے یا غیر مہذب انسان ہی ہیں۔ قرآن کریم کی آخری سورۃ کے آخری الفاظ سے بھی ظاہر ہے کہ "الناس" کے اندر دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں یعنی الناس بمعنی ظاہر اور مہذب اور الجنتہ بمعنی پوشیدہ یا غیر مہذب۔ اگر الناس اور الجنتہ سے مراد دو مختلف مخلوق ہوتیں تو **الذی یوسوس فی صدور الناس والجنتہ** کہہ دینا ہی کافی تھا۔ مگر کہا یہ گیا ہے۔ **اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ**۔ گویا النّاس کے لفظ کی تشریح کر دی گئی۔ کونسے النّاس؟ وہ النّاس جن میں مہذب اور غیر مہذب دونوں شامل ہیں۔ یہ موضوع کافی تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اس لئے اسے دہرانا غیر ضروری ہے۔ چنانچہ میں اب اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ یعنی آیت (15:26-27) کے مروّجہ مفہوم میں وہ کیا چیز ہے جو اکثر غلط بیان کی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (15:26)

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15:27)

"ہم نے انسان کو کھنکھناتے گارے سے پیدا کیا جو سن رسیدہ ہو کر (طبیعاتی اور کیمیائی اثرات سے) تغیر پذیر ہو چکا تھا۔ اور اس سے پہلے **جان** کو نارالسموم سے پیدا کیا۔"

آیت (15:27) کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اکثر کہا جاتا ہے "انسان کی تخلیق سے پہلے کُرۂ ارض پر بے پناہ حرارت تھی اس لئے ابتدا میں ایک ایسی مخلوق کی نمود ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ وہ مخلوق اب باقی نہیں رہی اور انسان اسی کا جانشین ہے۔"

یہ مفہوم قطعاً" غلط اور ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مخلوق **"جان"** یعنی نظر نہ آنے والی مخلوق اب بھی موجود ہے اور یہ کوئی زندہ مخلوق نہیں ہے۔ زندہ مخلوق اربوں سال بعد معرضِ وجود میں آئی۔ یہ نظر نہ آنے والی مخلوق کیا ہے؟ یہ ہے "توانائی کی لہریں"۔ سائنس کی دنیا میں پہلے سے یہ تصور موجود تھا کہ توانائی اور مادہ دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ توانائی اور مادہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ چنانچہ مادہ توانائی میں بدل سکتا ہے اور توانائی مادہ میں بدل سکتی ہے۔ اب ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہے کہ پانی کے ڈیم بنا کر کس طرح اس سے بجلی تیار کی جاتی ہے اور یہ بھی عام فہم چیز ہے کہ ایٹم بم میں ایک قلیل مادہ سے کس طرح بے پناہ توانائی معرضِ وجود میں لائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اپنے منفرد انداز میں آیت (15:27) میں ایک ایسے بڑے مسئلہ کی نشاندہی کی ہے جو مدّتِ مدید سے انسان کے ذہن میں ہی نہیں آیا تھا لیکن قرآن میں 14 صدیوں سے موجود تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ پہلے توانائی کو پیدا کیا اور بعد میں مادہ کو۔ پھر مادہ اربوں سال کی ارتقاء کے بعد انسان تک جا پہنچا۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ یہ (1) پہلی مخلوق نارالسّموم سے پیدا ہوئی (2) اور یہ کہ یہ مخلوق **"جان"** ہے یعنی نظروں سے پوشیدہ ہے۔

یہ حقیقت کہ یہ پہلی مخلوق توانائی کی لہریں ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ توانائی کی لہروں کی ماہیت کیا ہے؟ موضوع بہت طویل ہے لیکن میں اسے مختصر الفاظ میں بیان کرونگا۔

توانائی کائنات میں چار طرح سے حرکت میں آتی ہے۔

(1) Gravitational Energy کششِ ثقل کی توانائی، جس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے ذرات سے لے کر اربوں ٹن وزنی اجرام فلکی آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور باوجود تیز رفتار حرکت کے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

(2) Electro Magnetic Waves برقی مقناطیسی توانائی۔ اس برقی مقناطیسی لہروں میں کچھ لہریں زیادہ لمبی ہیں اور کچھ کم لمبی۔ کچھ میں توانائی زیادہ ہے کچھ میں کم۔ برقی مقناطیسی لہروں کی قسمیں ملاحظہ فرمائے۔

(الف) Cosmic Rays یا کائناتی لہریں۔ (ب) Gama Rays گاما لہریں۔ (ج) X-Ryas ایکس لہریں۔ (د) Ultra Violet Rays بالائے بنفشی لہریں۔ (ر) Light Rays روشنی کی لہریں۔ (ز) Infra-Red Rays گرمی کی لہریں (س) Wireless Rays لاسلکی لہریں۔ ان لہروں میں کائناتی لہروں سے لے کر لاسلکی لہروں تک

لمبائی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔

(3) Weak Nuclear Energy کمزور نیوکلیر توانائی۔

بعض دھاتوں میں سے مسلسل خود بخود توانائی خارج ہوتی رہتی ہے مثلاً آپکی گھڑی جس میں ریڈیم لگی ہو۔ اس میں سے اپنے آپ روشنی کی شعائیں خارج ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے آپ رات کو بھی وقت دیکھ سکتے ہیں۔

(4) Strong Nuclear Energy طاقتور نیوکلیر انرجی

سورج کے اندر ہائیڈروجن کے ایٹم' مسلسل ہیلیم میں بدلتے رہتے ہیں جس سے یہ انرجی کی لہریں نکل کر گردو نواح میں' جس میں کرۂ ارض بھی شامل ہے' پھیل جاتی ہیں۔ روئے زمین پر جس قدر حرکت ہے وہ انہیں لہروں کی وجہ سے ہے۔

قرآنِ کریم نے صرف مادی اشیاء کو بطور شہادت پیش نہیں کیا بلکہ کئی آیات میں توانائی کی لہروں کی بھی قسم کھائی ہے۔ مثلاً سورۃ الذاریات (51) سورۃ المرسلات (77) اور سورۃ النازعات (79) کی ابتدائی آیات میں۔ ان آیات میں بعض مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات مثلاً روزِ آخرت کے ثبوت میں توانائی کی لہروں کی قسم کھائی ہے اور انہیں بطور شہادت پیس کیا گیا ہے۔ ان کے نام نہیں لئے گئے بلکہ صرف ان کی صفات کا ذکر ہے۔ چونکہ ان کے نام نہیں لئے گئے اس لئے ہمارے غیر سائنس دان مفسرین نے انہیں مادی اشیاء سے منسوب کیا ہے۔

قرآنِ کریم نے ان توانائی کی لہروں کے دو افعال بیان کئے ہیں۔

(1) **مُقَسِّمٰتِ اَمْرًا** (51:4) تقسیم کار اور (2) **مُدَبِّرٰتِ اَمْرًا** (79:5) کائنات کے اندر تدبیرِ امور۔ کائنات کی ہر شے جاندار ہو یا بے جان' ہر آن تغیر پذیر ہے۔ ایک بے جان پتھر جو آپ کو بظاہر ساکن معلوم ہوتا ہے اس کے اندر بھی ایٹموں کی تیز رفتار حرکت موجود ہے۔ زندہ اشیاء نباتات اور حیوانات میں مسلسل حرکت موجود ہے۔ ایٹموں کے جوڑ توڑ سے ایک طرف تعمیری اور دوسری طرف تخریبی عمل جاری ہے۔ ایک طرف پت جھڑ ہے تو دوسری طرف پھل پھول اور نئے پتے نکل رہے ہیں۔ اسی طرح زندہ حیوانات میں' جب تک سورج سے برآمد ہونے والی توانائی کام کر رہی ہے' وہ زندہ ہیں۔ جب انرجی باقی نہ رہے تو زندہ شے بے جان ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بے جان اشیاء یوں ہی نہیں پڑی رہتیں بلکہ انرجی کی لہریں پھر انہیں ایسے مادے میں تبدیل کر دیتی ہیں جن میں زندگی کی نمود ممکن ہو سکے۔ **يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ** (6:96)

خود انسانی جسم کے تمام اعضا انہی توانائی کی لہروں کی وجہ سے کام کر رہے ہیں۔ توانائی ہے تو ہر عضو میں حرکت ہے۔ توانائی ختم ہو جائے تو موت ہے۔ اسی تدبیرِ امور اور تقسیمِ کار ہی کی وجہ سے کائنات، کا وجود قائم ہے۔ توانائی ہے تو زندگی ہے۔ توانائی نہیں تو موت ہے۔ گویا Physical World کا وجود توانائی کی لہروں کے وجود اور توازن پر قائم ہے۔

جآن

اب توانائی کی لہروں کے مختصر بیان کے بعد لفظ **جآن** (15:27) کی طرف لوٹ آیئے۔ **جآن** 'مادہ ج ن ن' کے معنی ہیں چھپی ہوئی یا نظروں سے اوجھل شے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا (6:77) جب رات کی تاریکی نے چھپا لیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا۔

ہر چیز جو چھپ جائے اسے **جَنَّ عَنْكَ** کہتے ہیں۔ **جنن** قبر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ مردے کو چھپا لیتی ہے۔ **جنین** اس بچے کو کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ کے اندر چھپا ہوا ہو۔ **لا جن بهذا الامر** کے معنی ہیں اس بات میں کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ اب پھر توانائی کی لہروں کو دیکھئے یہ مسلسل حرکت میں ہیں لیکن پوشیدہ ہیں۔ نظر نہیں آتیں۔ سوائے روشنی کی ان لہروں کے جو کسی چیز سے ٹکرا کر واپس لوٹ جائیں۔ توانائی کی کوئی لہر آپ کو نظر نہیں آتی۔ آپ شدید گرمی میں بیٹھے ہیں۔ گرمی آپ کے جسم پر اثر انداز ہو رہی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ آپ کا ریڈیو سیٹ یا ٹیلی ویژن کا آلہ لاسلکی لہروں کے ذریعے کام کر رہا ہے۔ لیکن یہ لہریں آپ کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ بالفاظ دیگر توانائی کی تمام لہریں **جآن** چھپی ہوئی ہیں۔

نَارِ السَّمُوْمِ (15:27) میں کہا گیا ہے کہ **جآن** یعنی نہ نظر آنیوالی مخلوق کو نار السّموم سے پیدا کیا۔ لفظ سموم 'مادہ س م م' کو قرآن کریم نے مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً (7:40) میں لفظ **سم** سے ایک تنگ سوراخ میں گھسنے کا تصور پایا جاتا ہے۔ **زهر** کو بھی سم اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ جسم میں تیزی سے گھس جاتی ہے۔ لغت میں ایک ہلکی اور تیز رفتار شے کو بھی **سم** کہا گیا ہے۔

بے دھوئیں کی آگ کو بھی **سم** کہا گیا ہے۔ اب دیکھئے کہ مادی کائنات میں وہ کونسی چیز ہے جو نظر نہیں آتی۔ جو ہلکی پھلکی اور تیز رو ہے اور جس میں اندر دھنس جانے کی صفت شدت سے موجود ہے اور جو بے دھوئیں کی آگ ہے؟ ظاہر ہے کہ توانائی کی لہروں کے سوا کسی دوسری چیز میں یہ صفات بدرجۂ اتم موجود نہیں۔ ہوا بھی ہلکی پھلکی چیز ہے تیز رفتار بھی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب تیز آندھی چلے تو ہوا زیادہ سے زیادہ 100 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ لیکن روشنی کی لہر ایک سیکنڈ میں لاکھوں میل دور نکل

جاتی ہے۔ اگر سم کے معنی زہر ہے تو انرجی کی لہروں سے زیادہ زہریلی چیز کونسی ہو سکتی ہے۔ جن میں اندر دھنسنے کی قوت لا انتہا ہے۔ (Cosmic Rays) کائناتی لہریں۔ گاما لہریں۔ ایکس لہریں تیزی سے اندر گھسنے کی وجہ سے مہلک ہیں۔ پھر ہر مادی شے کو جلایا جائے تو دھوئیں کا پیدا ہونا لازمی ہے لیکن توانائی کوئی دھواں نہیں اور یہ لہریں بذات خود آگ ہیں۔

اب آیات (15:26-27) کے معنی نکھر کر سامنے آگئے۔

"ہم نے انسان کو ایسے کھنکھناتے گارے سے پیدا کیا جو بن رسیدہ ہو کر تغیر پذیر ہو چکا تھا۔ اور **جآن** نظروں سے اوجھل مخلوق (توانائی کی لہروں) کو بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا"۔

چنانچہ قرآنِ کریم نے ایک بے مثل حقیقت کو بیان کر دیا کہ توانائی کو پہلے پیدا کیا گیا اور مادہ کو بعد میں۔ پھر مادہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا انسان تک جا پہنچا۔ پوری کائنات میں ہر حرکت کا انحصار توانائی کی لہروں پر ہے۔ توانائی کے بغیر مادہ کا وجود ہی بے معنی ہے۔

مادی ارتقا اب اس بے بنیاد مفروضے کو چھوڑ دیجئے کہ "کسی زمانے میں ایک ایسی مخلوق تھی جو آگ کی گرمی کو برداشت کر سکتی تھی اور اب وہ ناپید ہو چکی ہے"۔ مادی ارتقا کو بھی قرآنِ کریم نے اپنے حسین انداز میں مفصل بیان کر دیا ہے اور اس کے لئے **یومین' اربعہ ایام** اور **ستہ ایام** کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں **یومین**۔ کے دو ادوار ہیں۔ صرف مادی ارتقا اربوں سال تک جاری رہا۔ پہلے مادہ یونیفارم شکل میں موجود تھا۔ پھر اس سے Pro Star بنے۔ پھر ان Pro Stars سے Stars ستارے بنے۔ سورج بھی اوسط درجے کا ستارہ ہے۔ پھر سورج کے کچھ ٹکڑے علیحدہ ہو کر زمین بمع سیارے اور ان کے چاند معرض وجود میں آگئے۔ زمین پہلے آگ کا گولہ تھی اس پر زندہ اشیاء کا وجود ناممکن تھا۔ یہ حالت 3000 ملین (ملین = دس لاکھ) سالوں تک جاری رہی۔ پھر اگلے 1500 ملین سالوں میں سمندروں کے پانی میں زندہ خلئے موجود تھے۔ پھر زندہ اشیا کی ارتقا مزید 505 ملین سالوں تک جاری رہ کر موجودہ زمانے تک پہنچی۔ یہ ارتقا اربعتہ ایام میں ہوئی یعنی 4 ادوار میں۔ لیکن توانائی کی لہریں مادہ کے وجود سے پہلے معرض وجود میں آئیں۔ اگر کوئی صاحب ان ارتقائی مراحل کی تفصیل دیکھنے کے خواہشمند ہوں تو میری کتابوں Phenomena of Nature & The Quran (انگریزی) اور مظاہر فطرت اور قرآن (اردو) میں دیکھ سکتے ہیں۔

(نوٹ) سورج سے نکلنے والی توانائی تو ایک آگ ہے جس کا درجہ حرارت کئی ہزار سنٹی گریڈ ہے۔ تو پھر سطح زمین پر موجود زندہ اشیا اسے استعمال میں کیونکر لاتی ہیں۔ یہ ایک الگ طویل اور پیچیدہ موضوع ہے جسے میں نے عمداً" بیان نہیں کیا۔ مختصر یہ کہ پہلے یہ توانائی کی لہریں زمین کے Atmosphere میں سے گذرتی ہیں

جو سطح سمندر سے 1000 میل اوپر تک جاتا ہے، جسے قرآن نے **سَقْفًا مَّحْفُوْظًا** (21:32) کہا ہے- یہ Atmosphere چھلنی کا کام دیتا ہے- اس میں سے توانائی کے وہی حصے گذر سکتے ہیں جن میں زندگی محفوظ رہ سکے- پھر Atmosphere کا نچلا حصہ Tropho Sphere جو سطح زمین سے 7 میل تک اوپر جاتا ہے یہ وہ Sphere یا دائرہ ہے جس میں موسم بدلتے ہیں اور جہاں توانائی کی شدت کم ہوتی ہے- پھر زندہ اجسام نباتات و حیوانات جن میں انسان بھی شامل ہیں، کے اندر ایسی مشینریاں موجود ہیں جو توانائی کو قابلِ عمل شکل میں تبدیل کرتی ہیں-

---

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درسِ قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے-

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال- زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعتہ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر- جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ، مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں-

رابطہ :

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر، بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)

ٹیلی فون : کراچی **4571919** حیدر آباد 654906

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

عظمت ناز

خاک ہو جائیں گے ----------

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

یہ بند پڑھ کر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ انکل اقبالؒ نے یہ شعر سوئے ہوئے غریبوں کو جگانے کے لئے کہا تھا یا کاخ امراء کے در و دیوار ہلانے کے لئے۔ اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس سے غریب جاگ گیا؟ کیا غریب کی دنیا بدل گئی؟ کیا غریب غریب نہ رہا یا مزید غریب ہو گیا؟ اتنے سارے سوالوں کا ایک جواب تو یہ ہے کہ غریب بنیادی طور پر غریب ہوتا ہے اور غریب ہی رہتا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ میں نے یہ کیا "غریب غریب" کی رٹ لگا رکھی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے غربت کے دنوں میں غربت پر مضامین لکھنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے اس مضمون سے میری غریب برادری کی لاچاری و مجبوری میں ایک انچ بھی فرق نہیں آئے گا بلکہ ہو سکتا ہے بہت سے غریبوں کے زخم میری اس تحریر کی وجہ سے مزید "گرین" ہو جائیں۔ مگر کیا کیا جائے کبھی کبھی بندہ اپنے آپ سے بھی شرارت کرنے پر اتر آتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کا دل دکھ جائے تو معاف کر دیں۔ نہ بھی کریں تو غریبوں کی پرواہ کون کرتا ہے؟ جی ہاں تو میں بات کہہ رہی تھی غریب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام عمر اپنے احساس و شعور کو غفلت کی نیند سلائے رکھتا ہے اور سب سے بڑی خامی یہ کہ کبھی کبھی' کسی کے جگانے پر تھوڑی دیر کے لئے جاگ بھی جاتا ہے۔ مگر ابھی انگڑائی ہی لیتا ہے کہ پھر سلا دیا جاتا ہے۔ آج سے ساٹھ سال پہلے غریب سو رہا تھا کہ اقبالؒ نے ایک نظم لکھ کر اسے جگا دیا۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسنے والا غریب جب جاگا تو اس کا میلا کچیلا ہاتھ سرمایہ داروں' جاگیرداروں' استحصالی اور استبدادی قوتوں کے گریبانوں تک پہنچ گیا۔ مگر اس کا یہ کارنامہ جذباتی تھا اور استحصالیوں کے پاس عقل تھی۔ انہوں نے چپکے سے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ اب تو تمہارا پاکستان بننے والا ہے۔ وہاں جا کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج کون

نہیں جانتا کہ الگ وطن کے حصول کے لئے جس طبقہ نے اپنا وقت توانائی' وسائل' صلاحیتیں' خون' پسینہ اور عزت قربان کی وہ یہی غریب تو تھا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ الگ وطن مل گیا مگر بیچارا غریب' غریب ہی رہا۔ اس کے ازلی دشمن فرعون (سیاسی ٹولہ) ہامان (ملا و پیر) اور قارون (سرمایہ دار + جاگیردار) اس کی بوٹیاں نوچنے یہاں بھی پہنچ گئے۔ غریب دب گیا اور پھر سو گیا۔

انہی غریبوں میں سے مجھ جیسے اٹھ کر کبھی کبھی یہ نعرہ لگا لیتے ہیں۔

کماندا آں میں خون مڑھکا وگا کے
ہلاں نوں چلا کے مشیناں پواں کے
میں ووہٹی تے بچیاں دا سب موہ بھلا کے
کماندا آں دھکے بدیشاں چہ کھا کے
اے ہتھ نئ ہلاندے تے بانہہ نہیں ہلاندے
تے گدیاں تے بیٹھے نیں موجاں اڑاندے

ہو سکتا ہے اس مضمون کو کوئی امیر بھی پڑھ لے بہتر ہو گا کہ میں یہاں غریب کو تھوڑا سا Define کر دوں۔ غریب کی کوئی لمبی چوڑی تعریف نہیں ہوتی۔ بلکہ تعریف تو شاید ہوتی ہی نہیں۔ پیدل چلنے والا یہ "معاشی جانور" اونچے اونچے محل تعمیر کرتا ہے' مگر خود جھونپڑی میں رہتا ہے۔ امیروں کے علاقوں کی طرف جانے والی خوبصورت کشادہ سڑکیں تعمیر کرتا ہے' مگر خود ٹوٹی پھوٹی راہوں پہ چلتا ہے۔ اپنے سے بڑے لوگوں کے کتے اور گاڑیاں نہلاتا ہے مگر خود کتوں سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہے۔ یہ بھوکی' ننگی' بیمار' ان پڑھ' جاہل اور گنوار مخلوق اس ملک میں بکثرت دستیاب ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے غریب کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک قسم کو "مشرقی غریب" کہتے ہیں جو اپنے ملک میں غریب ہوتا ہی ہے۔باہر جا کر بھی غریب ہی رہتا ہے۔ دوسری قسم "مغربی غریب" کی ہے۔ یہ اعلیٰ نسل کا گورا چٹا غریب ہے۔ اسے پیار سے "Poor" بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف اپنے ملک میں غریب ہوتا ہے۔ مشرقی ممالک میں پہنچ کر اپنی گوری چمڑی کی بدولت یہی غربت ان ملکوں کا مشیر بلکہ (Consultant) بن جاتا ہے۔

ایک بڑی مصیبت اس مخلوق کے ساتھ یہ ہے کہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ آخر ہمیشہ غریب کیوں رہتا ہے۔ کبھی غلطی سے سوچ بھی لے تو فیصلہ نہیں کر پاتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ یہ اس لئے کہ ایک طرف استحصالی قوتیں اسے غریب کہہ' اسے اس کی' کم مائیگی کے احساس میں مبتلا رکھتی ہیں اور

دوسری طرف ہماری مذہبی پیشوائیت اسے یقین دلاتی رہتی ہے کہ تجھے خدا نے غریب بنایا ہے۔ اس لئے صبرو قناعت کر اور زمین پہ حکمران خداؤں سے یہ مت پوچھ کہ "میں غریب کیوں ہوں؟" قصور امیروں کا نہیں۔ یہ لکھا ہے ترے مقدر کا۔ اللہ کی کتاب کھولتا ہے اسے اس میں لکھا نظر آتا ہے۔ "فکر نہ کر ظالموں کی کھیتی کبھی نہیں پنپ سکتی (6:21)۔ غریب یہاں بھی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ درست ہے مگر کھیتی پنپے گی کس کی؟ میرے پاس تو کھیت ہی نہیں۔ پنپے گا کیا؟

ہاں یہ ضرور ہے کہ اسکا قانون سچا ہے۔ اسکا انصاف برحق ہے۔ میری کھیتی ہری ہو نہ ہو' ظالموں کی پکڑ ایک دن ضرور ہو گی۔ مگر کب؟ یہ "کب" اس کے حوصلے پر پہاڑ بن کر گرتی ہے۔ جب اسے بتایا جاتا ہے کہ صبر کر نتائج کے ظہور میں تھوڑا بہت وقت تو لگے گا ہی۔ آخر آہ کو بھی چاہئے اک عمر' اثر ہونے تک تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہہ اٹھتا ہے۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔

ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر

3082 - 7

نیشنل بنک آف پاکستان

مین مارکیٹ برانچ

مین مارکیٹ گلبرگ II - لاہور

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

صوبیدار میجر محمود الحسن (بورے والا)
(طلوع اسلام کنونشن 1994ء کا ایک خطاب)

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

کیا یہ دین قابل عمل نہیں؟

یہ ہے وہ موضوع جس پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی مذہب کے بارے میں یہ قول درست ہو لیکن اسلام دین ہے اور ضابطۂ حیات۔ یہ دین آج بھی قابلِ عمل ہے اور کل بھی رہے گا۔ اگر یہ ضابطہ باثبات ہے جیسا کہ ہے تو پھر قید زماں سے بے نیاز تادم حیات قابل پذیرائی ہے۔ بلکہ یہ ضابطہ تو موت کو بھی ایک طرح کی حیات بتاتا ہے۔ جینے کا قرینہ جیسے بھی بن پڑے آجاتا ہے' حالات سکھا دیتے ہیں' مرنے کا سلیقہ دنیا بہت کم جانتی ہے۔ دین اسلام اس پہلو سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے کہ وہ عجیب شان سے جان دینے کا فن سکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کے متعلق یہ مت کہو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں 2/155_ اسلام واحد دین ہے جس نے دنیا میں پہلی بار یہ حقیقت بتائی کہ اللہ کی راہ میں جان دینا موت نہیں زندگی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس معاشرے میں قربانی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ صداقت اسلام ہی نے دنیا کو سکھائی کہ جینا چاہتے ہو تو مرنا سیکھو۔

اوہ مٹ گئے نیں جنہاں نے جاناں بچایاں
سلامت نیں تیرے توں مٹ جان والے (پیر فضل گجراتی)

میں نے عرض کیا ہے اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ دین کے معنی وہ طریق زندگی ہے جو خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار پر متشکل ہو۔ مذہب یکسر انفرادی' دین سراسر اجتماعی۔ مذہب چند ارکان کی بجا آوری' دین تمام تر بحر عمل میں شناوری۔ کیا حسن عمل کا یہ ضابطہ اب قابل عمل نہیں رہا؟۔ کیا اب کچھ کیئے بغیر سب کچھ مل جاتا ہے؟۔ پہلے کی طرح اب بھی اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اصل چیز براہیمی نظر ہے۔ جو کہیں نظر نہیں آتی۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں' لا الٰہ الا اللہ

اسلامی معاشرے کا پہلا زینہ یہ ہے کہ دنیا سے ظلم مٹ جائے اور عدل قائم ہو۔ 6/22_ دوسرا یہ کہ کسی کی محنت کا پھل ضائع نہ کیا جائے۔ تیسرا زینہ یہ کہ بغیر کسی عوض و معاوضہ کے مخلوق کی خدمت کی جائے۔ چوتھا یہ کہ خدمت فطری رنگ میں ہو جیسے ماں اپنے بچے کی خدمت کرتی ہے۔ اس معاشرے کی ہر اٹھان اپنے ماں باپ سے شروع ہوتی ہے۔ سب سے بڑا حق روحانی ماں باپ کا' اس کے بعد جسمانی ماں باپ کا' پھر قریبی رشتہ دار اور پھر ہمسایہ۔ اسی طرح مہمان نوازی' مسافر کی خدمت' بیروں کی رستگاری۔ کمزوروں کا بوجھ اٹھانا یتامے اور مساکین کو سہارا دینا' اس معاشرے کے اندر مقروضوں سے خاص ہمدردی ملتی ہے 60 /9_ آج تیسری دنیا کے کئی ممالک اپنے وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنے قرضوں کا سود ادا نہیں کر سکتے بلکہ اصل بھی ادا کرنے کے قابل نہیں۔ اگر آج اسلامی معاشرہ زندہ ہوتا تو ان مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

قرآن کریم کی سو سے زیادہ سورتوں میں دین اور صلاۃ سے وابستہ ایسے تمام افراد کو ملعون کہا ہے جو یتیموں اور مسکینوں کی خبر گیری نہیں کرتے۔ 107/3,76/9_

اسلام میں پہلا دور خانہ کعبہ سے شروع ہوا اور اسی جگہ بنیادی اصول سکھائے گئے۔ اور یہ تعلیم دی کہ اسلامی معاشرے کے اندر کوئی فرد بھوکا نہ سوئے اور کوئی ننگا نہ پھرے۔ روٹی' کپڑا' مکان' تعلیم اور علاج کی سہولت فراہم کرنا سٹیٹ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اسلامی معاشرہ جبر و استبداد کا دشمن ہے۔ اس معاشرہ میں قوم کا سردار' قوم کا خادم ہوتا ہے۔ حق رسی کے لئے بلا امتیاز امیر و غریب رنگ و نسل ادنیٰ و اعلیٰ اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ وہ ہر کسی کا حق تسلیم کرتا ہے ہر کسی کو حق دلاتا ہے۔ اللہ یقیناً انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے 5/43_ دنیا آج بھی ان ضروریات سے بے نیاز نہیں۔ اسلام اب بھی قابل عمل ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ دین نہیں' دیندار بگڑتے ہیں اسلامی معاشرے میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے' **انفاق فی سبیل اللہ** کا پہلو نمایاں ہے۔ اور اس کی یہی روح ہے۔ جس باعث اسلامی معاشرے میں سود لینا اور دینا قطعی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ طیبات کو جائز رکھتے ہوئے یہ معاشرہ اسراف و تعیش کا مخالف ہے۔ دونوں

محرومی کا موجب بنتے ہیں۔ عیش کوشی یوں بھی مجاہدانہ صلاحیتوں کو معطل کر دیتی ہے۔

اسلامی معاشرہ **تعاونو اعلی البرو التقوی** پر قائم ہے۔ اس کا قبلہ شمع محمدیؐ ہے جس کے گرد یہ پروانوں کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ اسے شیطانی قوت سے بھی انکار نہیں کیونکہ ہر بلندی کے مقابل پستی کا وجود لازم ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہ پستی اس امت کو لازم نہیں کہ بلندیوں کی جانب پرواز سے روک دے۔

اسلامی معاشرے کی نماز جسے اس کی اصطلاح میں صلاۃ کہتے ہیں اس کے اندر پڑھے جانے والے کلمات اور اس کا قبلہ دونوں ہی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس معاشرے کے ہر فرد پر واجب ہے کہ بنی نوع انسان کو خیر عطا کرے۔ اور ہر ممکن شر سے محفوظ کرے۔ اس معاشرے میں مرکزیت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ فرد قائم ربط ملت سے ہے اس کا نظام معاشرتی' جمہوری قدروں پر قائم ہے۔

اسلامی معاشرہ ظاہری اور باطنی صفائی کا بہت خیال رکھتا ہے۔ گندگی ظاہری ہو یا باطنی اسے کسی صورت قبول نہیں۔ اس طرح نفاق' ریا' تکبر' خود بینی' غرور' کاہلی' بخل' بزدلی' بدظنی' غیبت' استہزا' تجسّس' برے ناموں سے یاد کرنا' اسراف' جہالت' ناشکری' بے صبری' خیانت' نفس پرستی' حق تلفی' ظلم' شرک' احسان فراموشی' حسد' جھوٹ اس طرح کی دوسری کمزوریاں جو قرآن اور حامل قرآن نے بتلائی ہیں ان کو بیماریاں تسلیم کرتا ہے۔ اور ان کی شفایابی کیلئے ہر تدبیر بروئے کار لاتا ہے۔ کیا اب دنیا ان مصائب سے نجات حاصل کرنے کیلئے کوشاں نہیں؟ یہ بیماریاں آج بھی شدت سے معاشرے میں موجود ہیں اسلام آج بھی ان بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کا طریق بتاتا ہے۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ابدی سعادتوں کے مصدر و مخزن قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں اور شاید اس لئے کلام الٰہی کے حقیقی شرف و اعزاز سے محروم ناکام و نامراد زندگی گزار رہے ہیں۔ معاشرے کی یہ اساس جاتی رہتی ہے تب یہ معاشرہ مردہ کہلاتا ہے۔ اور بے ثمر ہو جاتا ہے۔ اس معاشرے کی موجودہ صورت ہے ہی مردہ۔ لیکن

"بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں"

ایک منفرد خصوصیت یہ کہ یہ معاشرہ جب مرتا ہے تو پرویزؒ جیسی نادر ہستیاں چھوڑ جاتا ہے۔ جن سے نئی فکر پیدا ہوتی ہے۔ اور معاشرہ پھر نشوونما پانے لگتا ہے۔

اس معاشرہ میں مرد اور عورت کے حقوق یکساں ہیں۔ ہر دو ایک ہی نفس واحدہ کے حصے ہیں۔ میدان عمل مختلف ہے۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کروں گا۔

اسلامی معاشرے میں سب سے اچھا وہ سمجھا جاتا ہے جس کا سلوک اپنے بیوی بچوں سے اچھا ہو' چار

شادیوں کی اجازت ہے۔ لیکن ایسی کڑی شرائط کے ساتھ کہ اس رعائت سے فائدہ اٹھانا بہت مشکل ہے۔

اسلامی معاشرہ امانتوں کا محافظ ہے اور مسابقت الی الخیر کا عملی نمونہ ہے۔ تمام بنی نوع انسان کا دکھ اس کا دکھ ہے۔ ساری دنیا کی بھلائی اس کی خوشی ہے۔ یہ معاشرہ انسانی فطرت کے تقاضوں کی تشفی کے سارے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ جسم کی بقا و قیام اور نشوونما کے لئے بھی اس کے پاس ہر خیر ہے۔ کہئے معاشرت حسن کا وہ کونسا پہلو ہے جس کو اسلام نے نظر انداز کیا ہے؟۔ یہ دین قابل پذیرائی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جو اسے چلا ہوا کارتوس سمجھتے ہیں انہوں نے صرف ملا کو دیکھا ہے اسلام کو نہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے' دین ملا فی سبیل اللہ فساد اور کون نہیں جانتا۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ

ملا کی ستم کوشیوں کی تاریخ بڑی طویل اور درد ناک ہے۔ گذشتہ چودہ صدیوں پر محیط اس طبقہ کے افسانوں سے آج بھی بوئے خوں آتی ہے۔ تاریخ نامعلوم سے لیکر تادم تحریر ملا کی کفر سازیوں کی یہ توپ بدستور کفر کے بارودی گولے پھینک رہی ہے۔ اور امت مسلمہ میں ماضی و حال کی کوئی نمایاں شخصیت ایسی نہیں جو اس کی زد سے محفوظ ہو۔ ازمنہ تاریک کے یہ مہذب ڈاکو آج اکیسویں صدی کے روشن دور میں بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ کر اگر کوئی دین اسلام پر حرف گیری کرتا ہے تو تعجب کیا!!

تاریخ مذاہب عالم شاہد ہے جب کسی قوم کے قول و فعل میں تضاد پیدا ہو جائے وہ قوم ذلیل و رسواء ہو کر مٹ جاتی ہے۔ پاکستان کی بدنصیبی ہے کہ یہاں کسی امتی میں صدق مقالی' ایفاء عہد' عصمت زبان و بیاں اور قول و فعل میں مطابقت حسن اتفاق سے مل جائے تو مل جائے لیکن کسی نام نہاد عالم دین میں ان خصوصیات کو تلاش کرنا امر محال ہے۔

اس صورت حال کے ذمہ دار پہلے علماء پھر ان کے مقلد ہم خود ہیں۔

اسلامی معاشرہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ساری کائنات اس کے لئے مسخر کی گئی ہے' لہٰذا وہ ساری کائنات کے رموز و نکات تلاش کرنے میں لگا رہتا ہے 16/13- اس تنظیم کے اندر کوئی بات ایسی نہیں جو صداقت کے خلاف ہو۔ اسلام سے باہر کوئی اعلیٰ صداقت آپ کو نہیں ملے گی۔ لہٰذا اسے چلے ہوئے کارتوس سے تعبیر کرنا ظلم صریح ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

منظور احمد (ناروے)

تکلف بر طرف

☆ --- چندا ماموں کے نام کھلا خط --- ☆

محترم چندا ماموں ! تسلیمات !!!

آپ کہاں ہیں؟ کدھر ہیں؟ خدا را کبھی تو نظر آجائیں۔ نہ خراب کریں ہمارے روزے اور ہماری عیدیں۔ آپ کہیں ان لوگوں کی وجہ سے تو ناراض نہیں ہو گئے' جو آپ پر چڑھ دوڑنے کی فکر میں ہیں۔ ایسا نہ سوچئے' ہمارا مسئلہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ ہمیں نہ آپ کے کالے پتھروں سے غرض ہے نہ آپ کی سوتر مل سے واسطہ۔ ہمارا آپ کا تعلق اتنا ہی ہے کہ آپ ایک جھلک دکھا دیں اور ہماری عید ہو جائے۔ سال میں ایک دن کی بات ہے' مگر کتنا غیر یقینی ہے آپ کا نمودار ہونا' اس ایک دن بھی۔ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں آپ کو تلاش کرتے کرتے۔ اپنے تو اپنے اب تو غیر بھی باتیں بنانے لگے ہیں۔ سنا ہے' ایک ہندو بنیا (مہاجن) کسی مسلمان سے اپنا قرضہ وصول کرنے گیا۔ کہنے لگا۔ نمسکار میاں جی ! شما کیجئے' ایک مشکل آن پڑی ہے۔ میری رقم مجھے واپس کر دیں تو بڑی کرپا ہو گی۔ جواب ملا۔ چنتا نہ کریں لالہ جی ! چند دن اور انتظار کر لیں۔ اگلے چاند کی پہلی تاریخ کو رقم آپ کی' آپ کو واپس مل جائیگی۔ کہنے لگا' وہ تو ٹھیک ہے میاں جی ! پرنتو چندر ماں کا کیا بھروسہ۔ چڑھے چڑھے' نہ چڑھے نہ چڑھے۔ مجھے تو آپ انگریزی مہینے کی کوئی تاریخ بتا دیں۔

ویسے برا نہ منانا۔ آپ لوگوں نے پہلی کا چاند دیکھا بھی ہے کبھی؟؟؟--- دیکھا ہوتا تو آپ کے پرچم پر چاند الٹا نہ ہوتا--- نمسکار---- !! دیکھا آپ نے کیسی کیسی پھبتی کستے ہیں بیگانے بھی؟

ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم سے تقریباً 3,85,000 کلو میٹر دور ہیں۔ بایں ہمہ ہم آپ کو ننگی آنکھوں سے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہ ہماری تمنا ہی نہیں' ہماری شرعی ضرورت بھی ہے۔ گو اس کے لئے دوربین کا سہارا بھی لیا جا سکتا تھا' لیکن اس کے لئے ہمیں کسی سائنس ماسٹر سے پوچھنا پڑتا کہ جو چاند اس دوربین سے نظر آتا ہے وہ اصلی ہے یا کچھ اور۔ آپ کو یاد ہے ہمارے ہاں کل تک لاؤڈ سپیکر بھی حرام تھا۔ کتنے دور اندیش تھے ہمارے مفتیان کرام جنہوں نے لاؤڈ سپیکر پر بولنا حرام قرار دیا تھا۔ ہم اگر اپنے بزرگوں کی بات مان کر اسے حرام ہی رہنے دیتے' تو آج اس کے استعمال پر پولیس کے پہرے نہ بٹھانے پڑتے۔ لاؤڈ سپیکر کی

طرح دوربین کا استعمال بھی عام ہو گیا' تو نہ جانے ہمارے یہ پیشوا کون کون سے چاند چڑھائیں۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔

ہاں یاد آیا کتنے خوش نصیب ہیں زحل والے' جن کے بیس ماموں ہیں۔ اور جیوپیٹر والے بھی جن کے چاند جیسے 17 ماموں ہیں۔ ایک ہم زمین والے ہیں کہ جن کا صرف ایک ماموں ہے اور وہ بھی اتنا غیر متوقع کہ عید پر تو ہر سال پریشان کرتا ہے۔

دیار غیر میں رہنے والوں کی بھی سن لیں۔ جب ہم لوگ پاکستان میں تھے تو مسئلہ نہ پیچیدہ تھا نہ باعث ندامت۔ کسی نے آج عید منا لی۔ کسی نے اگلے روز۔ تیسرا دن بھی شامل ہو گیا تو مضائقہ نہیں۔ سب اپنے ہی تو تھے۔ ویسے بھی خوشی کے لمحات جتنے بھی دراز ہو جائیں' اتنا ہی اچھا ہے۔ بھلا ہو چارسدہ کے پٹھان بھائیوں کا' جن کی نظر کرم سے تین نہ سہی' دو عیدیں تو ہر سال ہو ہی جاتی ہیں۔ ابا جی مرحوم کو چارسدہ بہت پسند تھا۔ وہ روزے بھلے کسی اور جگہ رکھیں' عید چارسدہ ہی میں منایا کرتے تھے۔ یورپ میں یہ بات کہاں؟ یہ لوگ کہتے ہیں' یقینی طور پر ایک متعین دن بتاؤ تاکہ اس دن چھٹی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔ حرام ہے جو انہیں ہماری خوشیوں کا ذرا بھی احساس ہو۔ سال میں ایک تہوار کی تو بات تھی۔ کیا تھا جو دو تین دن منا لینے دیتے۔ کئی کئی ہفتے پہلے پوچھنا شروع کر دیتے ہیں کہ بتاؤ تمہاری عید کس دن ہو گی؟ اب انہیں کون بتائے کہ جب تک چاند نظر نہ آئے' ہم کیسے بتائیں کہ ہماری عید کب ہو گی۔

ویسے ٹھیک ہی کہتے ہیں یہ لوگ کہ تم دنیا کا ہر کام سورج کے حساب سے کرتے ہو۔ حتیٰ کہ نمازیں بھی سورج دیکھ کر ادا کرتے ہو۔ لیکن عید آتی ہے تو چڑھ دوڑتے ہو چھتوں پر چاند دیکھنے۔ چاند بھی وہ کہ ذرا سا لیٹ ہو جائے تو بیٹھے رہو اس کے انتظار میں مزید چوبیس گھنٹے۔ بہتر ہے تم پاکستان ہی چلے جاؤ۔

کسی مفکر نے (نام اس وقت یاد نہیں آرہا) کیا خوب کہا تھا کہ یہاں پر نئی سوچ کا پہلے تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ پھر اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے جاری ہوتے ہیں اور برسوں بعد تھک ہار کر اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ہم چندا ماموں کے ناز اٹھانے کی بجائے COSMIC LAWS کی تشریح کر رہے ہوتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم لاشعوری طور پر خود فریبی کا شکار ہیں یا خود اذیتی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً روزے تو سارے کافروں کے تیار کردہ کیلنڈر اور گھڑیوں کے مطابق رکھتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نہ کوئی انتہائے سحر کا اعلان کرتا ہے نہ غروب آفتاب کا منظر دیکھ کر افطاری کی خبر دیتا ہے۔ نماز تک کیلنڈر اور گھڑی دیکھ کر ادا کی جاتی ہے' لیکن عید منانے کے لئے نہ کیلنڈر پر بھروسہ ہے نہ گھڑی پر اعتماد۔ یہ عجیب بات ہے کہ سورج سے متعلق فراہم کردہ معلومات پر تو آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لیا جاتا ہے لیکن انہی رصد گاہوں کا تیار کردہ چاند کا کیلنڈر حرام قرار پاتا ہے' حالانکہ اس کے پیش کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مرتب

کردہ قمری کیلنڈر میں صدیوں بعد چند لمحوں کا فرق آتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر نہیں پیدا ہوتا تو بھی پوچھ لینے میں کیا حرج ہے کہ کیا سورج کافروں کا ہے۔ مسلمانوں کا نہیں؟ اور کیا چاند مسلمانوں کا ہے۔ کافروں کا نہیں؟ قرآن مجید کا اعلان تو یہ ہے کہ شمس و قمر دونوں سے ماہ و سال کا حساب رکھا جا سکتا ہے۔ پھر یہ تخصیص کیوں؟

میں نے ایک صاحب سے پوچھا۔ کیا چاند کھلی آنکھوں سے دیکھنا واقعی لازمی ہے؟ فرمانے لگے یہ سنت نبویؐ ہے۔ جی درست ! تو پھر یہ سنت نبویؐ پوری طرح کیوں ادا نہیں کی جاتی۔ آپؐ تو چاند نظر نہ آنے کی صورت میں اندازے سے عید کا اعلان کروا دیا کرتے تھے۔ کیلنڈر' گھڑی' ٹیلی فون اس وقت تھا نہیں۔ نہ ہی آپؐ مکے سے مدینے اور مدینے سے مکے گھڑ سوار بھجوایا کرتے تھے کہ معلوم کرو دوسری جگہ چاند ہوا ہے یا نہیں۔ لہٰذا آپ بھی ایسی صورت میں اندازے سے عید کا اعلان کروا دیا کریں۔ یہ دوسرے شہروں میں ٹیلی فون کر کے معلومات حاصل کرنا کہاں کی سنت ہے۔ اگر ٹیلی فون کرنا جائز ہے تو پھر المانک کو Follow کرنا کیوں حرام ہے؟ چلئے مان لیتے ہیں کہ چاند نظر آنا چاہئے مگر کہاں اور کس کو؟۔ پہلے اس کی حد گاؤں تک محدود تھی۔ پھر شہر تک بڑھی اور اب ملک کی حدود تک روا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو خانہ کعبہ کو مرکز تسلیم کرتے ہوئے رویت ہلال کی حد ممالک سے بڑھا کر اسلامی بلاک تک وسیع کر دی جائے۔

جغرافیائی حدود کا لحاظ ناگزیر ہو تو بھی دو دن میں چاند پوری پوری دنیا میں دکھائی دے جاتا۔ پھر عید میں دو دو' تین تین دن کا فرق کیوں؟۔ مسلمانوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مرکز ملت پر حج ہو رہا ہوتا ہے پوری ملت اسلامیہ ٹیلی ویژن پر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوتی ہے' لیکن یہ سب کچھ ہوتے دیکھ کر بھی اپنے ہاں ہم اسے یوم حج نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہمارے ہاں یوم حج اس سے اگلے دن اور عید اس سے بھی ایک' دو یا تین دن بعد ہو گی۔ یونہی اس پر کسی نے رائے زنی کی۔ بن گیا۔ کافر۔ ملحد۔ بے دین۔

ضمناً" ہمیں راس نہ آئی یہ بت گری
جسے بت بنایا' خدا ہو گیا

مگر کب تک؟ ابھی ان حضرات کے پاس چند اختیارات ہیں۔ اہل ثابت نہ ہو سکے تو فطرت اختیارات چھین لیا کرتی ہے۔ دوسری قوموں کے نااہل پیشواؤں کے ساتھ یہی کچھ تو ہوا ہے۔ کون پوچھتا ہے آج انہیں؟ آمدم برسر مطلب'

اتحاد و یکجہتی۔ قرآن کریم کی رو سے کس قدر لازمی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس واقع سے لگائیے کہ حضرت ہارونؑ نے سیدنا موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کی گو سالہ پرستی گوارا کر لی لیکن قوم کو تشتت و افتراق کے جہنم سے بچا لیا۔ گو سالہ پرستی جہالت کا نتیجہ تھا جس کا ازالہ باسانی ہو سکتا تھا لیکن تفرقہ

قوم میں فساد کا موجب بن جاتا جس کی تلافی ناممکن حد تک مشکل ہو جاتی' اس لئے حضرت ہارونؑ نے بڑے نقصان کے مقابلے میں کم نقصان والے شرک کو برداشت کر لیا۔ المانک کی صحت لاکھ مشکوک سہی لیکن قوم کو افتراق و انتشار کے مہلک مرض میں مبتلا کرنے والے عناصر سے تو بہرحال بری نہ ہو گی۔

خدا کے بندو! ہر سال آسمان پر نظریں گاڑھنے اور دو دو' تین تین عیدیں منانے کی بجائے کوئی ایک معیار۔ کوئی ایک طریق' کوئی ایک فارمولہ' باہمی مشاورت سے طے کر لو۔ ہمارا کھویا ہوا اتحاد بھی پھر سے لوٹ آئیگا اور عید بھی ہم باوقار طریق سے منا سکیں گے۔ ہمارا مقصد متحد ہو کر جشن نزول قرآن منانا ہے۔ رویت ہلال نہ ہماری منزل ہے نہ منتہی۔

ویسے چاند سے ہماری جو تھوڑی بہت عزیز داری ہے اسے قائم رکھا جانا چاہئے' کیونکہ اس سے ہمارے سماج میں خواتین کی مردوں پر بالا دستی کا ثبوت ملتا ہے۔ جی ہاں! اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ گھر میں مرد کو اگر تھوڑی سی فوقیت بھی حاصل ہوتی تو چندا' ماموں کی بجائے چچا کہلاتا' مگر ایسا کسی ایک گھر میں بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماں کی محبت نے لاشعوری طور پر ہمیں چاند کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے چاند کے ساتھ ہماری والہانہ عقیدت کا راز بھی اسی رشتے میں ہو جو مائیں بچپن ہی سے ہمارے ذہنوں میں راسخ کر دیتی ہیں ورنہ سورج کونسا ہمارے باپ کا رشتہ دار ہے جو اس کا نام لینے سے ہمیں خوف آتا ہو۔

-------- شب بخیر --------

معزز قارئین

میں ان تمام اعزہ اقرباء' دوستوں اور بہن بھائیوں کا تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں' جنہوں نے میری اہلیہ کی وفات پر کسی نہ کسی طرح رابطہ کر کے اظہار تعزیت کے پیغامات بھیجے اور خطوط بھی لکھے۔ چونکہ بذریعہ خطوط ان کا فردا" فردا" شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں تھا لہذا بذریعہ تحریر ہذا میں اپنے ان تمام کرمفرماؤں کا اپنی اور اپنے بچوں کی طرف سے بھی فردا" فردا" شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہمیں ہمت اور حوصلہ بندھانے میں مقدور بھر پذیرائی فرمائی اور ہمارے غم میں شریک ہوئے۔

والسلام خیر اندیش

سردار حمید

سیکرٹری جنرل بزم اوسلو ناروے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

کتاب کا نام :- قرآن اپنے آئینے میں
مصنف :- مقبول محمود فرحت

ملنے کا پتہ پاکستان میں :- گروپ کیپٹن ارشد محمود
223/T حبیب خان روڈ' نئی آبادی' لال کرتی' راولپنڈی کینٹ

یورپ میں :-
76 - PARK ROAD,
ILFORD, ESSEX, IGI ISF U.K.
TEL : 081 - 553 - 1896

زیر تبصرہ کتاب دراصل قرآنی احکامات کا انڈکس ہے جو بزم طلوع اسلام لندن کے نمائندے جناب مقبول محمود فرحت صاحب نے مرتب کیا ہے اور بقول محمد طفیل صاحب (جن کے تاثرات کتاب میں شامل ہیں) اس کی ترتیب میں انہوں نے کم و بیش بیس سال صرف کئے ہیں----

ایک عام قاری کے لئے یہ جاننا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کونسی بات قرآن کریم کے کس کس مقام پر اور کہاں کہاں بیان ہوئی ہے۔ سارے قرآن پر عبور' ہر انسان کو نہیں ہوتا لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ قرآن کریم کے تمام موضوعات کا انڈکس تیار کیا جائے اور جس موضوع پر جس قدر آیات قرآن میں جہاں جہاں آئی ہوں ان کی نشاندہی ایک ہی جگہ کر دی جائے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں اور عظیم کوشش تو جناب غلام احمد پرویزؒ ہی کی ہے کہ وہ "تبویب القرآن" کے نام سے تین بڑی جلدیں بہت پہلے پیش کر چکے ہیں لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ مختلف مقامات پر مختلف سطحوں پر مختلف انداز میں اس کام کو آگے بڑھایا جائے۔ مقبول محمود فرحت صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی جانفشانی سے اس کام کو آگے بڑھایا اور بڑے احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔

"قرآن اپنے آئینے میں" صرف محکمات پر مشتمل ہے اور ان احکام سے متعلق نہ صرف مختلف صفحات پر بکھری ہوئی آیات کو یکجا کر دیا گیا ہے بلکہ ان کی وضاحت بھی ساتھ ساتھ کر دی گئی ہے------

کتاب اگرچہ قیمتی سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے تاہم کتاب کی کتابت ڈیزائننگ اور طباعت پر تھوڑی مزید توجہ کتاب کے حسن میں اضافہ کر سکتی تھی۔

پیکنگ اور پوسٹیج کے لئے 9 روپے کے ٹکٹ بھجوا کر کتاب مفت منگوائی جا سکتی ہے۔

ادارہ طلوع اسلام جناب مقبول محمود فرحت صاحب کو ان کی اس احسن کاوش پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

(ناظم ادارہ)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اکثر سوال ابھرتے ہیں کہ :-

- اسلام کا معاشرتی، تمدنی، عسکری، سیاسی، معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا؟
- _____ اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ _____ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ :-

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اپنے انداز کی منفرد کتاب

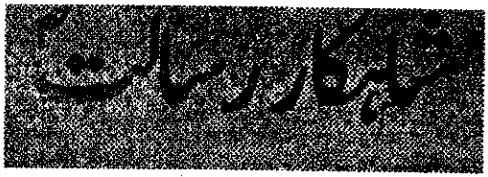

عمر فاروقؓ ——— میں ملے گا۔

جو مفکر قرآن جناب پرویزؒ کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

- نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختم نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے پانچ سو تیس صفحات پر مشتمل تصنیف ——————— قیمت (علاوہ ڈاک خرچ)

اعلیٰ ایڈیشن	Rs. 250/=
سٹوڈنٹ ایڈیشن	Rs. 100/=

مینجر طلوع اسلام ٹرسٹ

پاکستان میں

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
1- ایبٹ آباد	595 کے۔ ایل کیہل۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	منگل	3 بجے سہ پہر
2- ایبٹ آباد	K/355 کنج روڈ فون:5729	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
3- بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر5۔ رابطہ فون:2438	پہلا اور تیسرا جمعہ	9 بجے صبح
4- پشاور	دفتر جناب عبداللہ جانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔ رابطہ: 270737	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
5- پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
6- پیر محل	مکان نمبر140/139- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	9 بجے صبح
7- پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے سہ پہر
8- جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد' جی۔ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	6 بجے شام
9- جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
10- چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
11- چک 215 ای۔بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
12- حیدر آباد	گولڈن سینٹری' عثمان آباد	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
13- حیدر آباد	B-12 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
14- ڈی۔جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج' بلاک 2- کچہری روڈ	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
15- رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق' مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	10 بجے صبح
16- راولپنڈی	بمقام E-4385/47 اپر سٹوری ہائی وے آٹوز نزد پل لئی گوالمنڈی راولپنڈی فون:74752	جمعۃ المبارک	4-30 بجے شام
17- سرگودھا	60- اے سول لائنز' ریلوے روڈ۔ رابطہ فون:720083	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
18- سیالکوٹ	محمد افضل خلجی' ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: 87658	پہلا اور دوسرا جمعہ	10 بجے صبح
19- فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون۔ 42855	ہر جمعۃ المبارک	3-30 بجے شام
20- کراچی	چمن زاہد 19- بی بلاک 13- ڈی گلشن اقبال مقابل اردو سائنس کالج رابطہ خلد گل فون: 539798	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
21- کراچی	مکان 16 گلشن مارکیٹ' C/36 ایریا کورنگی 5 رابطہ: محمد سرور' فون: 312631	جمعۃ المبارک	11-30 بجے صبح
22- کراچی	مکان E-282 قصبہ کالونی نزد لودھی ہاؤس رابطہ: ڈاکٹر اسلم نوید۔ فون: 6660578	جمعۃ المبارک	4 بجے سہ پہر
23- کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ لیاز حسین انصاری رابطہ فون: 4571919	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
24- کراچی	برمکان محمد یونس 1206- گلی 10- اے' G-36' شریف کالونی۔ لانڈھی انوار رابطہ: فون: 312631		8 بجے شب
25- کوہاٹ	برمکان شیر محمد' نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
26- کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ	جمعۃ المبارک	4 بجے سہ پہر
27- گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ' سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
28- گجرات	مرزا ہسپتال' کچہری روڈ	جمعرات	3 بجے
29- لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
30- لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	جمعۃ المبارک	بعد نماز مغرب
31- ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
32- ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک 509 گ ب	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
33- لوکاڑہ	برمکان میاں محمد سعید مکان 116 گلی 6 سیٹھ کالونی نمبر 2 رابطہ فون: 3660	ہر جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
34- واہ کینٹ	برمکان محمد داؤد' کوارٹر نمبر 19E/119		

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Parwez (r)
BOOKS AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THE FOLLOWING PLACES.

1. CANADA
716 The West Mall,Suit 1804
Etobicoke, ONT (416) 620-4471
First Sun
11AM

2. DENMARK
Nattergaleveg 98, St Tv.,
2400 Copenhagen NV
Last Sat
2 PM

3. Kuwait
Flat No. 6, Floor No. 3
Taher Bu Hamad Building Oppsite Al-Othman Mosque,
Hawally, Kuwait
Friday
5.PM

4. NORWAY
Akeberg Veien-56, Oslo-6
Galgeberg, 4th floor
1st Sun
4PM

5. UNITED KINGDIM

(i) Birmingham
229 Alum Rock Road
Sunday
3PM

(ii) London
76 Park Road Ilford Essex
Phone 081-553-1896
1st Sun
2:30PM

(iii) Yardley
633 Church Road, Yardley, Birmingham
B33 8HA (Phone 021-628-3718)
Last Sun
2PM

(iv) Essex
50 Arlington Road, Southend-on-Sea
ESSEX SS2 4UW, Phone 0702-618819
2nd Sun
3PM

(v) Yorkshire
Cardigan Community Centre
145-49 Cardigan Road LEEDS-6
Contact M. Afzal Phone 0532-306140
1st Sun
3PM

ON AIR

Dars-e-Quran on TV-9
Oslo (NORWAY)
Thursday
21:00PM